مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۸ | محرم الحرام ۱۴۳۹ھ | اکتوبر ۲۰۱۷ء | شمارہ ۱۰

ترجیح الآخرۃ

اہتمام آخرت

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹
پتہ دفتر: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ترجیح الآخرۃ

(اہتمام آخرت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	خطبۂ ماثورہ	۹
۲.....	حق تعالیٰ کا شکوہ	۹
۳.....	مضر شے کے درجات	۱۱
۴.....	غفلت کا درجہ	۱۳
۵.....	نماز سے فواحش کا سدباب	۱۴
۶.....	دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا نتیجہ	۱۶
۷.....	آخرت سے بے فکری کا نتیجہ	۱۸
۸.....	توحید کامل کا اثر	۲۰
۹.....	ریاء کی حقیقت	۲۱
۱۰.....	تقدیر کی حقیقت	۲۲
۱۱.....	شریعت میں اعتقاد کا درجہ	۲۳
۱۲.....	توبہ کے بھروسہ پر گناہ کی ممانعت	۲۵
۱۳.....	مال وجاہ کے شعبے	۲۷

۱۴..... ادائیگی میراث میں کوتاہی ۲۷

۱۵..... وراثت کا مال لینے میں احتیاط کا تقاضا ۲۹

۱۶..... بدوں رضامندی کسی چیز کا استعمال جائز نہیں ۳۰

۱۷..... ہمدردی کرنے اور قرض دینے کا نتیجہ ۳۳

۱۸..... چندوں کا غبن ۳۴

۱۹..... دین کو مصالح کے تابع بنادیا گیا ۳۷

۲۰..... خواص کی خرابیاں ۳۹

۲۱..... اصلاح اخلاق کی ضرورت ۴۲

۲۲..... حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی احتیاط ۴۳

۲۳..... جاہ، مال سے زیادہ مرغوب ہے ۴۶

۲۴..... حب جاہ کے نتائج ۴۷

۲۵..... محض صورت دین کا نام دین نہیں ۴۹

۲۶..... صورت اور حقیقت میں فرق ۴۹

۲۷..... صورت وحقیقت دونوں ضروری ۵۰

۲۸..... روح اور جسم کا تعلق ۵۱

۲۹..... عالم برزخ (قبر) میں جسم مثالی ۵۲

۳۰..... ظاہر و باطن دونوں ضروری..... ۵۳

۳۱..... اخلاص کی ضرورت..... ۵۵

۳۲..... نفس کا کید خفی..... ۵۷

۳۳..... مطلق طلب دنیا کی ممانعت نہیں..... ۵۸

۳۴..... عادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع..... ۵۹

۳۵..... شیوخ کاملین کی حالت..... ۶۱

۳۶..... دیوان حافظ کا مرتبہ..... ۶۲

۳۷..... طریق اصلاح وتربیت..... ۶۲

۳۸..... ارادہ دنیا کی قسمیں..... ۶۴

۳۹..... صحابہ کا طلب دنیا..... ۶۵

۴۰..... لفظ دنیا کا نکتہ..... ۶۷

۴۱..... محبوبانہ عتاب..... ۶۷

۴۲..... سوال وجواب..... ۶۹

۴۳..... آخرت کی صفات..... ۷۰

۴۴..... آخرت کی دوسری صفت..... ۷۱

۴۵..... شبہ کا جواب..... ۷۳

۴۶..... آخرت کا وقوع..... ۷۳

وعظ

ترجیح الآخرۃ

(اہتمام آخرت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے آخرت کی فضیلت پر یہ وعظ باغ عبدالباقی خاں واقع الہ آباد میں شب دوشنبہ بعد عشاء ۱۰ شعبان ۱۳۴۰ھ کو قریباً ۹۰۰ کے مجمع میں کھڑے ہوکر فرمایا جو اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوا اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قلمبند فرمایا۔

شریعت نے تمتع دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ ترجیح دنیا علی الآخرۃ سے منع کیا ہے۔ پس دنیا کو بقدر ضرورت طلب کرنا خواہ تجارت سے ہو یا ملازمت سے یہ حرام نہیں۔ ہاں! دین کو برباد کرکے دنیا کمانا حرام ہے۔ بہت سی ایسی باتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کو عام طور سے لوگ گناہ نہیں سمجھتے اور اکثریت اس میں مبتلا ہے عوام وخواص سب کے لئے انتہائی مفید وعظ ہے۔

اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۲/۷/۲۰۱۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاo وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی ﴾(۱)

حق تعالیٰ کا شکوہ

ان آیتوں میں سے مجھے اول آیت کا بیان کرنا مقصود ہے اور اخیر کی دو آیتیں اسی پہلی آیت کی تاکید میں ہیں اس لیے میں نے بھی تاکیداً ان کو پڑھ دیا ہے ورنہ مقصود پہلی آیت ہے کیونکہ وہی اصل ہے اور یہ دونوں اس کی تابع ہیں۔ پس بیان میں بھی ان کے ساتھ متبوع وتابع کا سابرتاؤ کیا جائے گا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہماری ایک حالت کا بیان فرمایا ہے۔ پھر اس پر شکایت فرمائی ہے اور جس طرح اس حالت کے درجات مختلف ہیں کہ اس کا ایک درجہ

(۱) ''مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں (پس زیادہ ترمؤکد ہوا) سورۃ الاعلیٰ:۱۶ تا ۱۹۔

کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک درجہ اہل ایمان واہل کفر دونوں میں مشترک ہے اسی طرح شکایت کے بھی درجات مختلف ہیں۔ بڑے درجہ میں زیادہ شکایت ہے اور چھوٹے درجہ میں کم، لیکن چھوٹا درجہ اہل ایمان اور کفار میں مشترک ہے اس لیے اس درجہ میں شکایت مشترک ہے۔

اب سنئے وہ حالت کیا ہے اور اس پر شکایت کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾(۱) اس میں لفظ بل اعراض کے لیے ہے یعنی پہلی بات سے اعراض کر کے اس کے مقابل دوسری بات کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾(۲)

اس میں فلاح کا طریقہ بتلایا ہے کہ بامراد ہو وہ شخص جو (قرآن سن کر خبیث عقائد واخلاق اور ناشائستہ اعمال سے) پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔ اس کے بعد لفظ بل اعراض کے لیے لایا گیا ہے یعنی مگر اے منکرو! تم قرآن سن کر اسے نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ فلاح کے مقابل ہماری یہ حالت ہے گو اس میں مقابلہ کی تصریح(۳) نہیں مگر لفظ بل مقابلہ کو بتلاتا ہے کیونکہ وہ موضوع ہے اعراض کے لیے جس کی حقیقت ہے پہلے کی نفی اور دوسرے کا اثبات اور اثبات ونفی میں تقابل ظاہر ہے۔ پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا(۴) فلاح کے خلاف ہے اور اس سے فلاح مبدل بہ خسران ہوجاتا ہے(۵) پس ہماری وہ حالت یہ ہے کہ ہم اپنی فلاح کا اہتمام نہیں کرتے اور اس پر خدا تعالیٰ کی شکایت یہ ہے کہ تم دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔

پس یہ مضمون نہایت قابل اہتمام ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس جگہ جو شکایت

(۱) سورۃ الاعلیٰ: ۱۶ (۲) سورۃ الاعلیٰ: ۱۴۔۱۵ (۳) واضح طور پر مقابلہ کا ذکر نہیں ہے (۴) آخرت پر ترجیح دینا (۵) کامیابی خسارہ میں تبدیل ہوجائیگی۔

بیان فرمائی ہے وہ معمولی شکایت نہیں بلکہ اس کا نتیجہ فلاح سے محرومی اور خسران میں مبتلا ہونا ہے(۱) اول تو خود حق تعالیٰ کا شکایت فرمانا ہی ہمارے اہتمام کے لیے کافی محرک ہونا چاہیے اور ہم کو ڈرنا چاہیے کہ شاید حق تعالیٰ ہماری ہی شکایت فرمارہے ہوں۔ اور یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ احکم الحاکمین کو کسی سے شکایت ہو۔ ایک ادنیٰ حاکم کسی کی شکایت کرتا ہے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ پھر مسلمان کو خدا کی شکایت سن کر ضرور بیدار ہوجانا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ وہ شکایت ایسی بات کے متعلق ہے جس کا نتیجہ ہمارے ہی حق میں مضرت رساں ہے(۲)۔ خدا تعالیٰ کا اس سے کوئی ضرر نہیں۔

اور ہر چند کہ مخاطب اس آیت کے بظاہر کفار ہیں مگر اس سے ہم کو بے فکری اور جسارت نہیں ہوسکتی کیونکہ دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے کے درجات مختلف ہیں۔ کفار میں اس کا بڑا درجہ ہے اس لیے ان سے شکایت بھی بڑی ہے اور ہمارے اندر اسکا چھوٹا درجہ ہے تو ہم سے شکایت گو کم درجہ میں ہے، مگر ہے ضرور کیونکہ جب منشاء موجود ہے تو شکایت ضرور ہوگی۔ پس یہ سمجھ کر ہم کو جسارت(۳) نہ کرنا چاہیے کہ اس کے مخاطب کفار ہیں اور ہمارے اندر اس درجہ کی غفلت نہیں جس درجہ کی کفار میں ہے کیونکہ جب ہمارے اندر بھی کسی درجہ کی غفلت موجود ہے تو اس سے بے فکری نہیں ہوسکتی۔

مضر شے کے درجات

دنیوی معاملات میں غور کرلیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس مضر(۴) شے میں مختلف درجات ہوں ان میں یہ کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ درجہ اعظم کو چھوڑ کر عظیم کو اختیار کیا جاتا ہو۔ عشاق کا مذاق تو سب سے الگ ہے ان کو تو خدا تعالیٰ کی ادنیٰ ناگواری بھی پہاڑ معلوم ہوتی ہے مگر شکم پروروں(۵) کو ادنیٰ درجہ میں شاید کچھ گنجائش معلوم ہوتی ہو لیکن

(۱) کامیابی سے محروم ہوکر نقصان میں مبتلا ہونا ہے (۲) نقصان دہ (۳) یہ ہمت نہ کرنی چاہئے کہ اس کے مخاطب ہم نہیں کفار ہیں (۴) نقصان دہ چیز (۵) پیٹ کے پجاری۔

اعظم اور عظیم میں تو یہ لوگ بھی ایسا نہیں کرتے کہ اعظم کو چھوڑ کر عظیم کو گوارا کرلیں اور ادنیٰ درجہ میں بھی گنجائش ان کو نظر آتی ہو۔ وہ دین ہی میں نظر آتی ہے ورنہ دنیا میں تو وہ ادنیٰ درجہ کی مضرت سے بھی ویسے ہی احتیاط کرتے ہیں جیسی بڑے درجہ کی مضرت سے احتیاط کی جاتی ہے(۱)۔ مثلاً یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی شخص اپنے چھپر میں بڑا انگارا پڑنے سے تو احتیاط کرتا ہو اور چھوٹی چنگاری سے احتیاط نہ کرتا ہو بلکہ دونوں سے یکساں احتیاط کی جاتی ہے۔

اسی طرح مٹی کے تیل میں دیا سلائی چھوڑ کر کوئی مطمئن نہیں ہوتا حالانکہ دیا سلائی اس میں گر کر بعض دفعہ خود ہی گل (۲) ہوجاتی ہے۔ مگر پھر بھی احتیاط کی جاتی ہے کیونکہ جتنے لوگ جلے ہیں وہ تنور یا انجن ہی کی آگ میں جل کر نہیں مرے بلکہ اکثر ایک دیا سلائی ہی نے کام تمام کردیا ہے۔ اسی لیے عقلاء ایک چنگاری سے ویسا ہی عذر کرتے ہیں جیسا تنور یا انجن سے کرتے ہیں بلکہ چنگاری سے بچنے کی زیادہ تاکید کرتے ہیں کیونکہ نادان آدمی اس کو خفیف (۳) سمجھ کر اس سے احتراز کم کرتے ہیں (۴)۔ اسی لیے آپ نے کسی عاقل کو انجن یا تنور کی آگ سے احتیاط کی تعلیم کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ اس تعلیم کی ضرورت نہیں اس سے تو ہر شخص خود ہی بچتا ہے۔ ہاں ڈبیہ اور چنگاری سے احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے اپنے بڑوں کو بہت دیکھا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مضرت کا ادنیٰ (۵) درجہ زیادہ قابل اہتمام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی لوگوں سے خلوت کو منع کرنے میں زیادہ سخت الفاظ نہیں فرمائے اور نامحرم اقارب سے خلوت کے بارے میں ارشاد ہے

(۱) چھوٹے نقصان سے بچنے کی بھی ایسے ہی فکر ہوتی ہے جیسے بڑے نقصان سے بچنے کی (۲) بجھ جاتی ہے (۳) ہلکا (۴) بچنے کا اہتمام نہیں کرتے (۵) نقصان کے ابتدائی درجہ سے بھی بچنا چاہئے۔

''الحموات الموت ''(۱) یعنی کسی نے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! عورت اگر اپنے دیور کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے تو کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو موت ہے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ اس کو لوگ خفیف سمجھتے ہیں اور خفیف سمجھ کر اس سے احتیاط نہیں کرتے اور تربیت کا اصول یہ ہے کہ لوگ جس مضرت کو خفیف (۲) سمجھیں، مربی و حکیم اس سے زیادہ ڈرایا کرتا ہے۔

اب نفس کا یہ عذر غلط ہو گیا کہ اس کے مخاطب تو کفار ہیں کیونکہ معلوم ہو گیا کہ تقدیم دنیا علی الآخرت کے مختلف درجے ہیں (۳) کفار میں بڑا درجہ ہے ان کو اس سے منع کیا گیا اور تمہارے اندر چھوٹا درجہ ہے تم کو اس سے منع کیا جاتا ہے۔ شکایت کی علت اور منشاء میں غور کرنا چاہیے جب وہ موجود ہو تو شکایت بھی ضرور ہوگی۔ پھر جس درجہ کو آپ کم سمجھتے ہیں وہ مضرت اعظم کے سامنے صغیرہ ہے مگر فی نفسہ صغیرہ نہیں۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تو د (۴)

غفلت کا درجہ

اسی طرح گو ہمارے اندر جو درجہ غفلت کا ہے وہ اس غفلت سے کم ہے جو کفار میں ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی عظیم ہے جس نے ہمارے دین کو ناقص اور مردہ بنا رکھا ہے۔ لہٰذا اس کے مخاطب ظاہر میں گو کفار ہی ہیں مگر اشتراک علت کی وجہ سے جہاں جہاں یہ علت موجود ہوگی سب ہی مخاطب ہوں گے۔ اگر مسلمانوں کو اس کا مخاطب نہ مانا جائے تب تو یہ بات اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں سے اس امر کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ان کا اسلام ہی اس سے روکنے

(۱) الصحیح للبخاری: ج۔ص ۴۸، الصحیح لمسلم کتاب السلام: ۲۰، سنن الترمذی: ۱۱۷۱، مشکوۃ المصابیح: ۳۱۰۲، تفسیر ابن کثیر: ۵۲/۶ (۲) جس نقصان کو ہلکا سمجھے (۳) دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کے مختلف درجات ہیں (۴) ''یعنی آسمان عرش کے سامنے چھوٹا ہے لیکن فی نفسہ چھوٹا نہیں، زمین سے تو ہزاروں درجے بڑا ہے''۔

کے لیے کافی ہے۔ مستقل خطاب کی ضرورت نہیں اور صدور نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا صادر ہونا مسلمان سے عقلاً ممتنع ہے بلکہ ممتنع عادی مراد ہے کہ مسلمان سے اس کا صدور عادۃً ممتنع ہے(۱) اور شرائع میں اس نکتہ کا بہت لحاظ کیا گیا ہے کہ جو امور مخاطب سے عادۃً ممتنع الصدور ہوں(۲) ان سے صراحتاً منع نہیں کیا گیا کہ اس سے تو یہ خود ہی بچیں گے۔

مثلاً زنا اور چوری سے منع کیا گیا، شراب پینے پر وعیدیں بیان کی گئیں لیکن شرب بول (پیشاب پینے) واکل غائط (پاخانہ کھانے) سے صراحتاً منع نہیں کیا گیا کیونکہ عادتاً مسلمان بلکہ صحیح الحواس سے یہ فعل ممتنع ہے اس سے بچنے کے لیے اس کا اسلام وصحت حواس خود زاجر ہے۔ خطاب مستقل کی کیا ضرورت ہے اور (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ)(۳) ''بے شک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے''۔ میں نہی کے معنی یہی زاجر ہوتا ہے۔

نماز سے فواحش کا سدباب

بعض لوگوں کو اس پر اشکال ہوجاتا ہے کہ نماز فحشاء والمنکر ات سے کیونکر روکتی ہے، ہم تو نمازیوں کو فحش حرکات(۴) کرتے ہوئے ملاحظہ کرتے ہیں، ان صاحبوں کے نزدیک نماز کے منع کرنے کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ نماز حساً فحش کام سے روکتی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کی ہیئت ایسی ہے کہ اپنے اقتضاء سے فحشاء ومنکر سے زاجر ہے(۵)۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ قانون ڈکیتی سے منع کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب کون سمجھتا ہے کہ قانون ڈکیتی کا صدور(۶) نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قانون میں اس کی ممانعت ہے اور سخت سزا بتلائی

(۱) عقلاً ناممکن نہیں ہے بلکہ عادۃً ناممکن ہے (۲) جو کام آدمی عادتاً نہ کرتا ہو اس سے عموماً منع نہیں کیا جاتا (۳) العنکبوت: ۴۵ (۴) بے حیائی کے کام (۵) روکنے والی ہے (۶) واقع۔

گئی ہے۔ اب اگر کوئی قانون پر عمل نہ کرے تو اس سے یہ کلام غلط نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح مسلمانوں کو اس آیت کا مخاطب نہ ماننے سے اس بات کو ماننا پڑے گا کہ مسلمان سے اس کا صدور ہی نہیں ہوسکتا اس لیے نہی مستقل کی حاجت نہیں تو اس طریق سے تو اس فعل کی قبح میں (۱) اور زیادہ شدت ہوگئی کیونکہ اب مطلب یہ ہوا کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا کافروں ہی کا کام ہے۔ مسلمان کو اس کا اسلام ہی اس سے روکتا ہے اس لیے اس کو مخاطب نہیں بنایا گیا تو اس سے صاف یہ لازم آیا کہ جو مسلمان ایسا کرتا ہے وہ کافروں کا کام کرتا ہے اور یہی مطلب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا: (من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر)

یعنی جس نے نماز کو عمداً ترک کیا وہ کافر ہوگیا یعنی اس نے کافروں کا کام کیا کیونکہ عادتاً مسلمان سے نماز کا ترک صادر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس زمانہ میں واقعہ یہی تھا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں: (كان فرق مابيننا وبين المنافقين ترك الصلوة) کہ ہمارے اور منافقوں کے درمیان میں نماز کا ترک کرنا ہی مابہ الامتیاز تھا (۲)۔

تو یہ فقد کفر ایسا ہے جیسے ہم اپنے بیٹے کو کہیں کہ تو پورا چمار ہے (۳)۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو چماروں کے کام کرتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تو واقع میں چمار ہے اسی طرح حدیث کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ غرض مسلمانوں کو اگر اس آیت کا مخاطب نہ مانا جائے تو عتاب اور زیادہ شدید ہوگا۔ اب یہ بہانہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اس آیت کے مخاطب نہیں ہیں یہ تو کفار کے حق میں ہے۔ صاحبو! پھر تو اور زیادہ افسوس ہے کہ جو شکایت حق تعالیٰ کو کفار سے تھی آپ اسی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

(۱) برائی (۲) ترک نماز ہی سے امتیاز ہوتا تھا (۳) بھنگی یعنی جمعدار۔

دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا نتیجہ

اب سمجھئے کہ وہ حالت ہماری کیا ہے جس کی حق تعالیٰ شکایت فرمارہے ہیں۔ وہ حالت یہ ہے کہ ہم دنیا کو آخرت پر مقدم کررہے ہیں اور یہ مرض ایسا ہے کہ ہم اس کو مرض ہی نہیں سمجھتے۔ اس میں عام ابتلا ہورہا ہے، گناہوں کی فہرست میں چوری، زنا، شراب خوری کو سب گنیں گے، سود لینے اور رشوت لینے کو بھی گناہ سمجھیں گے لیکن کہیں یہ بھی کسی ذہن میں آتا ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا بھی گناہ ہے۔ اس طرف کسی کو بھی التفات نہیں(۱) اس کو گناہ تو کیا سمجھتے بلکہ بعض اوقات یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیادار آدمی ہیں، ہم سے دنیا کو نہیں چھوڑا جاتا، یہ کام تو انہی لوگوں کا ہے جو بیوی اور بچے نہ رکھتے ہوں، دنیا سے بالکل بے غرض ہوں۔

پس ترجیح دنیا علی الآخرت کے بعض افراد(۲) کو تو یہ لوگ گناہ ہی نہیں سمجھتے اور جس درجہ کو معصیت(۳) سمجھتے ہیں اس میں اپنے کو عاصی(۴) نہیں سمجھتے کیونکہ جب انہوں نے اپنے کو معذور سمجھ لیا تو معصیت کہاں رہی۔ ان لوگوں نے کسی سے سن لیا ہے کہ معذوری اور مجبوری کی حالت میں گناہ گناہ نہیں رہتا جیسے کسی نے ایک شخص کو دھمکی دی کہ شراب پیو ورنہ مادڈالوں گا اور وہ دھمکی دینے والا ایسا کربھی سکتا ہے تو اس صورت میں شریعت اس شخص کو حفاظت نفس کے لیے اجازت دیتی ہے کہ شراب پی لے۔ اس حالت میں شراب پینے سے تم کو گناہ نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ سن کر لوگ ہر جگہ اس کو جاری کرنے لگے اور بات بات میں اپنے کو معذور سمجھ کر گناہ پر دلیر ہوگئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس قانون شرعی کی یہ تفسیر آپ نے خود ہی تو کی ہے مگر آپ کو اس کا کیا استحقاق ہے، آپ کو شریعت کے اکراہ(۵) کے حدود بھی پوچھنا چاہیے۔

---

(۱) توجہ نہیں (۲) دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی بعض صورتوں کو (۳) گناہ (۴) گناہگار (۵) مجبوری کی حد معلوم کرنی چاہئے۔

اکراہ کے باب میں فقہاء نے اس کے حدود بیان فرمائے ہیں جس سے معلوم ہوسکتا کہ شریعت میں اکراہ کا وہ کون سا درجہ ہے جس سے انسان معذور ہوسکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ جو تفسیر اکراہ کی آپ نے خود کی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دیہاتی سرحدی نے قانون ریلوے کی تفسیر کی تھی کہ وہ ریل سے ایک من بھر کا کشمش کا بورا لے کر بغل میں دبائے نکلا۔ جب پلیٹ فارم کے دروازہ پر پہنچا تو ٹکٹ بابو نے اس کو ٹوکا کہ ٹکٹ لاؤ، اس نے ٹکٹ دکھادیا، بابو نے کہا کہ اس سامان کی بلٹی بھی دکھاؤ، اس نے پھر وہی ٹکٹ دکھادیا۔ بابو نے کہا یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے، سامان کا ٹکٹ دکھاؤ۔ سرحدی نے کہا کہ یہی ہمارا ٹکٹ ہے اور یہی سامان کا ٹکٹ ہے۔ بابو نے کہا، نہیں! یہ سامان پندرہ سیر سے زیادہ ہے، اس کے لیے جدا ٹکٹ کی ضرورت ہے تو سرحدی صاحب کیا فرماتے ہیں: کہ نہیں! ریلوے نے پندرہ سیر کا قانون اس لیے مقرر کیا ہے کہ ہندوستانی آدمی اس سے زیادہ نہیں اٹھاسکتا اور حقیقت میں اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ جتنا اسباب[1] مسافر خود اٹھاسکے وہ معاف ہے اور جو اس سے زیادہ ہو جس کے لیے مزدور کی ضرورت ہو اس پر محصول لگایا جائے گا۔ چونکہ ہندوستانی آدمی پندرہ سیر سے زیادہ خود نہیں اٹھاسکتا اس لیے پندرہ سیر کی تعیین کردی گئی اور ہم لوگ من بھر سے زیادہ خود اٹھاسکتے ہیں اس لیے ہمارا یہی پندرہ سیر ہے اس پر محصول نہیں ہوسکتا۔

تو کیا ریلوے کمپنی اس سرحدی کی اس تفسیر کو قبول کرسکتی ہے، ہرگز نہیں! وہ اس کے جواب میں یہ کہے گی کہ تم کو قانون کی تفسیر کرنے کا کوئی حق نہیں، قانون کا مطلب تم کو ہم سے پوچھنا چاہیے۔ اسی طرح قانون شرعی کی تفسیر کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں اور نہ آپ اس تفسیر کی بنا پر معذور ہوسکتے ہیں۔ غرض لوگوں نے

(۱) سامان۔

اپنے دل میں یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے میں مجبور ہیں، اس لیے اس کو معصیت ہی نہیں سمجھتے اور اگر معصیت سمجھتے بھی ہیں تو نہایت ہی کم درجہ کی اور گناہ کبیرہ کو صغیرہ سمجھنا یہ خود معصیت ہے۔

جیسے کوئی شخص ڈکیتی کو ودیعت میں خیانت (۱) کرنے پر قیاس کرنے لگے اور یہ سمجھے کہ خیانت مذکورہ میں بھی دوسرے شخص کے مال کا ضائع کرنا ہے اور ڈکیتی میں بھی اس لیے یہ دونوں ایک درجہ کے جرم ہیں۔ تو حاکم وقت اس شخص پر دخل اندازی قانون کا جرم قائم کرے گا اور یہ کہے گا کہ جب قانون میں ڈکیتی اور خیانت کی سزائیں مختلف ہیں کہ ڈکیتی میں عبور دریائے شور (۲) یا چودہ برس کی قید سخت ہے اور خیانت میں یہ نہیں تو تم کو دونوں کے برابر کر دینے کا کیا استحقاق ہے؟ تم قانون میں دخل بے جا کرتے ہو۔

اسی طرح شریعت میں جب ہر گناہ کی سزا الگ ہے تو سب کو برابر سمجھنے کا کسی کو حق نہیں اور اگر کوئی صغیرہ سمجھے گا اس پر دوسرا جرم تحریف شریعت کا قائم ہوگا۔ اس لیے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ معصیت کو خفیف سمجھنا معصیت ہے، بلکہ یہ قرب کفر ہے۔ (۳)

آخرت سے بے فکری کا نتیجہ

حق تعالیٰ اسی کو شکایت فرماتے ہیں کہ تم ترجیح دنیا علی الآخرۃ کے مرض میں مبتلا ہو۔ فرماتے ہیں: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (ای علی الآخرۃ ۱۲) وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ (۴)

یعنی تم اس کی کوشش کرتے ہو کہ دنیا میں عیش وعشرت اچھی طرح ہو آخرت چاہے کیسی ہی برباد ہو جائے اس جگہ آخرت کے متعلق ایک لفظ تو خیر کا فرمایا ہے جو کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور

(۱) امانت میں خیانت پر قیاس کرے (۲) ملک بدر کیا جانا (۳) گناہ بلکہ کفر کے قریب ہے (۴) ''بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت دنیا سے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے'' سورۃ الاعلیٰ: ۱۶۔۱۷۔

بہت بہتر ہے۔ دوسرا لفظ ابقی فرمایا کہ وہ بھی اسم تفضیل ہے کہ آخرت بہ نسبت دنیا کے پائیدار بھی ہے مگر پھر بھی تم دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہو اور آخرت سے بے فکر ہو۔

حالانکہ ایک امر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ آخرت سے بے فکری کے ساتھ دنیا اور گندی ہو جاتی ہے۔(۱) چنانچہ میں آگے بتلاؤں گا کہ آخرت فی نفسہ بھی قابل اہتمام تو ہے ہی مگر اس لیے بھی قابل اہتمام ہے کہ دنیا کی حلاوت(۲) اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ آخرت کی فکر ہو اور جو لوگ آخرت سے بے فکر ہیں بخدا ان کو دنیا کا بھی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ (یہ مضمون بالکل اخیر میں بہت ہی مختصر مذکور ہوا۔ غالباً ارادہ مفصل بیان کرنے کا تھا مگر یاد نہیں رہا)۔

اب سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کی اس شکایت کے ہم مصداق ہیں یا نہیں تو کفار کا مصداق شکایت ہونا تو ظاہر ہے مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمان بھی آج کل اس شکایت کا مصداق بنے ہوئے ہیں ہر شخص اس مرض میں مبتلا ہے کہ اس کو بہ نسبت آخرت کے دنیا کا زیادہ اہتمام ہے، یہ تو میں نہیں کہتا کہ مسلمانوں کو آخرت کا اعتقاد نہیں یا وہ اعتقاداً آخرت کو دنیا سے کم سمجھتا ہو، ہاں، کفار کا یہ اعتقاد ہو سکتا ہے کیونکہ بعض کفار تو سرے سے آخرت ہی کے منکر ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی مٹی میں مل جاتا ہے نہ اس کو کسی جگہ عذاب ہوگا نہ ثواب۔ اور بعض کفار کو آخرت کا اعتقاد اگر ہے بھی تو وہ ایسا اعتقاد ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا تھا، اس کے ایک دم تھی اور ایک سونڈھ تھی۔ اس تفسیر سے ہر شخص سمجھ لے گا کہ اس نے بادشاہ کو ہرگز نہیں دیکھا، نہ معلوم کس الابلا(۳) کو دیکھ لیا ہے۔ اسی طرح جو کفار آخرت کے معتقد ہیں وہ اس کے متعلق ایسے خرافات بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے معتقد نہیں کسی دوسری چیز کے معتقد ہیں۔ اس لیے ان کا اعتقاد عدم اعتقاد کے حکم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری

(۱) آخرت سے بیفکر ہونے کی وجہ سے دنیا اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے (۲) مٹھاس ولذت (۳) فضول، بے کار۔

کوشش دنیا ہی میں صرف ہو جاتی ہے، آخرت کی ان کو ذرا فکر نہیں۔

تو مسلمانوں کی یہ حالت تو نہیں ہے وہ آخرت کے معتقد بھی ہیں اور آخرت کا علم بھی ان کو صحیح طور پر حاصل ہے اور اس کو دنیا سے افضل بھی سمجھتے ہیں مگر یہ میں ضرور کہوں گا کہ ان کا عمل اس اعتقاد کے موافق نہیں، وہ صرف اعتقاد آخرت ہی کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں اس سے عمل میں کام نہیں لیتے۔ ہر چند کہ اعتقاد کی خود بھی ضرورت ہے اور وہ فی نفسہ بھی مقصود ہے مگر اعتقاد کی ایک غایت عمل بھی ہے یعنی شریعت نے جو اعتقادیات کی تعلیم دی ہے اس سے دو مقصود ہیں ایک یہ کہ فی نفسہ ان امور کا اعتقاد رکھا جائے، دوسرے یہ کہ ان سے عمل میں کام لیا جائے کیونکہ یہ بات تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اعتقاد کو عمل میں بہت دخل ہے۔ ایک عارف فرماتے ہیں:

موحد چہ برپائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس ہمیں است بنیاد توحید وبس(۱)

توحید کامل کا اثر

دیکھئے! اس میں توحید کو اعمال میں مؤثر بتلایا گیا ہے کہ جب توحید کامل ہو جاتی ہے تو اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ خدا کے سوا کسی سے رجاء(۲) وخوف نہیں رہتا۔ ایک آیت میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے اور حدیث کے مل جانے سے تو تصریح ہوگئی۔ آیت یہ ہے۔ ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾(۳)

حدیث میں اس جملہ لا یشرك کی تفسیر میں لا یرائی وارد ہوا ہے۔ یعنی عبادت

(۱) ''موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دے یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید وخوف اس کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ہوتا، توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے'' (۲) امید (۳) ''یعنی جس شخص کو خدا تعالیٰ سے ملنے (اور ان کے پاس جانے) کا اعتقاد ہو اس کو نیک عمل کرنے چاہئیں اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے'' (الکہف: ۱۱۰)۔

میں شریک نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ریا نہ کرے اور یہ تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گویا حق تعالیٰ کی تفسیر ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود(۱)

اب اس آیت میں دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اعتقاد لقاء رب کو عمل صالح میں بہت دخل ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا﴾(۲) کو مرتب فرمایا ہے اور شرط وجزا میں علاقہ سببیت کا ہوا کرتا ہے۔

ریاء کی حقیقت

دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتقاد لقاء رب کو زوال ریاء(۳) میں بھی دخل ہے کیونکہ وَ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ کو بھی فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ'' پر مرتب کیا گیا ہے۔ پس اعتقاد کو نفس عمل میں بھی دخل ہوا اور کمال عمل میں بھی اور آیت میں ریاء کو جو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت ریاء کی یہ ہے کہ عبادت کو کسی کے دکھلانے کے واسطے کیا جائے اور ظاہر ہے کہ جس کو دکھلانا مقصود ہوتا ہے وہ بھی فی الجملہ عبادت میں مقصود ہے تو اس شخص نے عبادت میں خدا کے ساتھ دوسرے کو بھی شری کرلیا اور یہ شرک فی القصد ہے اس لیے ریاء کو حق تعالیٰ نے شرک فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ توحید صرف لا معبود الا اللہ کا نام نہیں یعنی توحید صرف اس کا نام نہیں کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھے بلکہ لا مقصود الا اللہ بھی کمال توحید ہے یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو مقصود بھی نہ سمجھے اور جب خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ سمجھے گا تو اب اس کی کسی پر نظر نہ رہے گی نہ کسی سے خوف وطمع ہوگی۔

(۱) ''آپ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اگرچہ یہ اللہ کے بندہ (سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے نکلا ہے'' (۲) الکہف: ۱۱۰ (۲) اللہ کی ملاقات کا اعتقاد ہونے سے ریاء اور دکھلا وا ختم ہوجاتا ہے۔

اسی کو عارف نے بیان فرمایا ہے:

موحد چہ برپائے ریزی زرش چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس ہمیں است بنیاد توحید وبس(۱)

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جو شخص ریاء کار ہوگا اسی کو مخلوق سے امید وہراس بھی ہوگا اور جو ریاء سے پاک ہوگا اس کو کسی سے امید وہراس بھی نہ ہوگا کیونکہ اسکی غیر حق پر نظر ہی نہ ہوگی۔ غرض اس آیت وحدیث کے ملنے سے یہ معلوم ہوا کہ اعتقاد کو عمل اور درستی عمل میں بڑا دخل ہے۔

مجھ کو پہلے یہ مسئلہ ایک آیت سے معلوم ہوا تھا، پھر تو ہر جگہ یہی سمجھ میں آنے لگا وہ آیت ہے: ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ﴾(۲)

اس سے پہلے حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾(۳)

تقدیر کی حقیقت

اس میں حق تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ جو کچھ تم کو پیش آتا ہے سب سے پہلے مقدر ہو چکا ہے۔ آگے ارشاد ہے: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ ''بے شک یہ خدا تعالیٰ پر آسان ہے'' کیونکہ اس کو علم غیب حاصل ہے تو پہلے سے

(۱) ''موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دے یا اس کے سر پر تلوار رکھیں، امید وخوف اس کو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ہوتا، توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے'' (۳) ''تاکہ جو چیز تم سے جاتی ہے اس کا رنج نہ کرو اور جو چیز تم کو عطا کی ہے اس پر اتراؤ نہیں'' سورۃ الحدید: ۲۳ (۳) ''یعنی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب (لوح محفوظ) میں (پہلے سے) لکھی ہوئی ہے۔ (یہ بات) بتلا اس واسطے دی ہے کہ تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج (اتنا) نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں'' سورۃ الحدید: ۲۲۔۲۳۔

آئندہ ہونے والے واقعات کا لکھ دینا اسے کچھ مشکل نہیں۔ آگے فرماتے ہیں: ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ اس میں ''لام کے'' ہے جس کے متعلق کی ضرورت جو یہاں مذکور نہیں بلکہ مقدر ہے۔ یعنی واخبرناکم بذلك لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ اور ہم نے تم کو یہ بات بتلا اس واسطے دی تا کہ جو چیز تم سے جاتی رہے (عافیت یا اولاد و مال و جاہ) تم اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز خدا نے تم کو دی ہے اس پر اتراؤ نہیں کیونکہ مصیبت کے وقت جب اس مضمون کا استحضار ہوگا کہ یہ پہلے ہی سے مقدر تھی۔ تقدیر میں اسی طرح تھا اس سے رنج میں کمی ہو جائے گی اور نعمت کے متعلق جب یہ سمجھ لیا جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل سے پہلے ہی اس کو میرے واسطے مقدر کر دیا تھا اس سے ناز و عجب پیدا نہ ہوگا کیونکہ اترا وے تو وہ جس کا استحقاق ذاتی ہو، یا اپنے آپ اس نے نعمت کو حاصل کیا ہو اور جب دوسرے کے حکم و مشیت سے ایک چیز ملی ہے اس پر اترانے کا کیا استحقاق ہے تو اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر کے بیان کرنے کی حکمت یہ بتلائی ہے تا کہ اس اعتقاد کی بدولت مصیبت میں صبر کی توفیق ہو اور راحت میں عجب و دلال (۱) نہ پیدا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ امور اعتقادیہ کو وجود اعمال و اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔

شریعت میں اعتقاد کا درجہ

اور شریعت کا مقصود یہ ہے کہ اعتقادیات سے عمل میں بھی کام لینا چاہیے چنانچہ اسی مقصود کو سمجھ کر محدثین نے یہ کہا ہے کہ اعمال ایمان کا جزو ہیں اور اعمال کے کم و بیش ہونے سے ایمان میں بھی زیادت و نقص ہوتا ہے۔ (اور معتزلہ و خوارج نے تو یہاں تک ترقی کی کہ ایمان بدون عمل کے کوئی چیز نہیں) مگر محققین کے نزدیک گو اعمال ایمان کا جزو نہیں ہیں مگر مکمل ایمان ضرور ہیں۔ پس ہر چند کہ

(۱) تکبر اور بڑائی۔

ایمان عقائد ہی کا نام ہے مگر ایمان کے کمال وضعف کا مدار اعمال پر ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مقاصد میں ہمیشہ درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے۔ درجہ ضعف پر کوئی اکتفا نہیں کیا کرتا۔ چنانچہ مقصد دنیویہ میں ہر شخص درجہ کمال ہی کا طالب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض عقائد کی تصحیح کافی نہیں بلکہ تصحیح اعمال بھی ضروری ہے ورنہ بدون تصحیح عمل کے عقیدہ بھی کامل نہ ہوگا۔ دنیا کے کاموں میں مشاہدہ اس کا کرلیا جائے۔

دیکھئے! اگر آپ کسی شخص سے یہ کہیں کہ زید تیرا باپ ہے اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب محض یہ نہیں ہوتا کہ دل میں اس کے باپ ہونے کا اعتقاد کرلیا جائے بلکہ مراد یہ ہوتی ہے۔ تم کو اس کے ساتھ ادب وتعظیم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اگر مخاطب اپنے باپ کے ساتھ ادب وتعظیم کا برتاؤ نہ کرے تو آپ اس کو ملامت کریں گے کہ کم بخت میں نے تم کو بتلادیا تھا کہ زید تیرا باپ ہے پھر بھی تو نے اس کی تعظیم کا حق ادا نہ کیا۔

معلوم ہوا کہ امور اعتقادیہ سے محض اعتقاد مطلوب نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقتضا پر عمل کرنا بھی مطلوب ہوتا ہے اور اگر عمل اس کے موافق نہ ہو تو اس اعتقاد کو کالعدم سمجھا جاتا ہے۔

ان مقدمات کے بعد میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اگرچہ آخرت کا اعتقاد ہے اور اس کو دنیا سے افضل بھی سمجھتے ہیں مگر ان کا عمل اس اعتقاد کے موافق نہیں ہے۔ پس بقاعدۂ مذکورہ(۱) یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو آخرت کا اعتقاد کامل طور پر نہیں کیونکہ جس اعتقاد کے موافق عمل نہ ہو وہ اعتقاد ناقص ہے۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مضمون کس قدر ضروری ہے اور ہمارا اعتقاد وعمل موافق نہ ہونا ہماری حالت سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال میں جس وقت دنیا وآخرت کا تعارض ہوتا ہے وہاں دنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً نماز کے وقت

(۱) مذکورہ قاعدے کی بنا پر۔

آپ کی دکان پر کوئی خریدار آ گیا تو اس وقت عموماً نماز میں تاخیر کر دی جاتی ہے اور دنیا کے نفع کو مقدم کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی ترجیح ہے آخرت پر۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کی ممانعت

اسی طرح اگر کوئی حسین عورت پر نظر پڑی۔ اس وقت ایسے لوگ بہت کم ہیں جو آخرت کے خیال سے نگاہ نیچی کر لیں۔ اکثر لذت نفس کے لیے اس کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ یہ بھی اسی گناہ کی فرد ہے کہ آخرت سے دنیا کو مقدم کیا گیا۔ پھر کوئی تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہم سے یہ نہیں ہوسکتا کہ آخرت کو دنیا پر مقدم کریں۔ یہ کام تو بزرگوں کا ہے۔ تو یہ لوگ تو گناہ کر کے اپنے کو گنہگار بھی نہیں سمجھتے اور بعض لوگ گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں مگر دل کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ بعد میں توبہ کر لیں گے۔ اس غلطی میں بہت کم لوگ مبتلا ہیں مگر یاد رکھو یہ سراسر دھوکہ ہے نفس کا۔

ہم نے مانا کہ توبہ گناہ کے لیے تریاق ہے مگر تریاق کے بھروسہ زہر کھا لینا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو سنکھیا دو تولہ اس بھروسہ پر کھاتا ہو کہ میرے پاس تریاق ہے بعد میں اسے کھالوں گا۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو اس کو سب لوگ بے وقوف بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زہر کا ضرر تو فی الحال تھا اور تریاق کا نافع ہونا فی المآل تھا(۱) اور وہ بھی موہوم کیونکہ ممکن ہے کہ زہر کا اتنا قوی اثر ہو جائے جو تریاق سے بھی زائل نہ ہو یا زہر کا اتنا فوری اثر ہو جائے کہ تم کو تریاق کھانے کی نوبت ہی نہ آئے۔

اسی طرح توبہ کے بھروسہ گناہ کرنا بھی سراسر حماقت ہے کیونکہ معصیت کا ضرر فی الحال ہے اور توبہ کا نفع فی المآل ہے اور وہ بھی موہوم۔ کیا خبر اس گناہ کے بعد حیات بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کے واقعات سنے گئے

(۱) زہر کا اثر فوری تھا اور تریاق کا اثر مستقبل میں ہوگا۔

کہ وہ عین حالت زنا میں مرگئے، گناہ سے فارغ ہونے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ دوسرے ایک مرتبہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرکے پھر اس گناہ کا چسکا پڑ جاتا ہے پھر توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ توبہ کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ آئندہ کے لیے پختہ عزم کیا جائے کہ پھر یہ گناہ کبھی نہیں کریں گے۔ محض لفظی توبہ قابل اعتبار نہیں کہ اے اللہ میری توبہ! گناہ کے بعد جب اس کا چسکا لگ جاتا ہے تو توبہ کے وقت نفس یہ کہتا ہے کہ اس توبہ سے کیا نفع۔ کیونکہ کام تو پھر بھی کرنا ہے تو اب توبہ بھی گئی۔ اس وقت نفس یہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کام سے جی بھر جائے تو سب گناہوں سے اکٹھی توبہ کرلیں گے مگر یہ وعدہ بھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ حدیث میں ہے کہ گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے جو بار بار گناہ کرنے سے بڑھتا رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہر گناہ زنگے ست برمرأۃ دل　　دل شودزیں زنگہا خوار وخجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی　　نفس دوں رابیش گردد خیرگی(۱)

تو اس زنگ کی ظلمت اتنی غالب ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور اگر کوئی اس سے توبہ کے لیے کہے بھی تو وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ میاں اتنے گناہوں کے سامنے بے چاری توبہ کیا کرے گا اب اس کو رحمت خداوندی سے مایوسی ہوجاتی ہے۔

چنانچہ بعض محتضرین (یعنی جو حالت نزع میں مبتلا تھے) کو لوگوں نے کہا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلو۔ انہوں نے یہی جواب دیا کہ میاں اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیونکر مٹا سکتی ہے۔ پھر ظالم اسی حالت میں بدون توبہ کیے مرگئے۔ تو آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا بڑا نفس کا دھوکہ ہے کہ توبہ کے بھروسہ گناہ کی رغبت دلاتا ہے۔

(۱) ''ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ کا داغ ہے جس کی وجہ سے دل ذلیل وشرمندہ ہوجاتا ہے اور جب دل کی تاریکی زنگ کی زیادتی سے بڑھ جاتی ہے تو کمینے نفس کی حیرانگی بڑھ جاتی ہے''۔

صاحبو! خدا سے ڈرو اور نفس کے اس دھوکہ میں نہ آؤ۔ حدیث میں ہے کہ اے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا گناہ کو حقیر نہ سمجھو۔ حقیقت میں جو لوگ توبہ کے بھروسہ گناہ پر پیش قدمی کرتے ہیں وہ گناہوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ غرض ہر شخص کے پاس معصیت (۱) کے اختیار کرنے اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا ایک سبب اور داعی موجود ہے کوئی اس سے بچا ہوا نہیں۔ الا ماشاء اللہ ہر شخص کچھ نہ کچھ سبب نکال لیتا ہے۔ کوئی اپنے کو معذور سمجھ لیتا ہے کوئی توبہ کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہے۔

مال وجاہ کے شعبے

اور یوں تو دنیا کے بہت شعبے ہیں مگر دو شعبے سب سے بڑے ہیں، مال اور جاہ۔ مال اور جاہ (۲) کے حاصل کرنے کے لیے اکثر لوگ معصیت سے نہیں بچتے۔ آخرت کو برباد کر لیتے ہیں اور اگر یہ حضرت مولوی ہیں تو وہ معصیت کو طاعت (۳) اور دنیا کو دین بنانے کی کوشش کریں گے۔ مگر یاد رکھو! خدا کے سامنے یہ تاویلیں نہ چل سکیں گی۔ بہرحال لوگ طرح طرح کے اموال کے لیے دین کو برباد کر رہے ہیں۔ کوئی رشوت لیتا ہے، کوئی زبردستی اور جبر سے لوگوں کا مال وصول کرتا ہے۔ گو اس کا موقع ہر ایک کو نہیں ملتا، رشوت ستانی وظلم کے اسباب ہر شخص کے پاس کہاں ہیں۔ البتہ ایک صورت تو بہت ہی کثیر الوقوع ہے جس میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ کسی کا روپیہ قرض لے کر ادا کرنے سے غافل ہیں، کسی کی چیز گھر میں آ گئی تو اب اس کو پہچانا نہیں چاہتے۔

ادائیگی میراث میں کوتاہی

میراث میں اللے تللے (۴) سے کام کرتے ہیں، یہ تو ان کا حال ہے جو

(۱) گناہ (۲) مال واقتدار (۳) گناہ کو نیکی (۴) فضول خرچی سے کام لیتے ہیں۔

میراث کے مال کو چھپاتے نہیں اور بعض لوگ تو میراث کا مال چھپا بھی لیتے ہیں۔ اگر کسی لڑکی کا انتقال ساس کے یہاں ہوا تو وہ اس کے برتن اور کپڑے اور زیور کو دبا لیتی ہے، ماں باپ کو تھوڑا سا دکھلا دیا کہ بس اس کے پاس تو یہی تھا اور اگر ماں باپ کے یہاں انتقال ہو تو جو ان کے ہاتھ لگتا ہے وہ شوہر کو اس کی اطلاع نہیں کرتے۔ یہ تو بالکل گوہ در گوہ ہیں، گفتگو تو ان لوگوں میں ہے جو چھپاتے اور دباتے بھی نہیں مگر خرچ کرنے میں بے احتیاطی وہ بھی کرتے ہیں۔ بعض جگہ مردہ کے اوپر قیمتی دوشالہ ڈالا جاتا ہے پھر وہ غریبوں کو دیدیا جاتا ہے۔ اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ورثہ کا مشترک تھا جس میں نابالغ بھی ہوتے ہیں اور جو سب بالغ بھی ہوں تو دل سے راضی نہیں ہوتے۔ پھر غمی کی رسوم میں سارا خرچ مردہ کے ترکہ میں سے ہوتا ہے۔ خرچ ہوتا ہے سب ورثہ کے حصہ میں سے اور نام ہوتا ہے بڑے وارث کا۔

افتخار اور ناموری کے لیے تو اپنے مال کا خرچ کرنا بھی حرام ہے اور دوسروں کے مال سے نام کرنا تو اور زیادہ اشد ہے۔ پھر اس میں نابالغوں کا بھی حق ہوتا ہے اور بالغین بھی راضی نہیں ہوتے۔ اگر رضا مندی ہوتی تو شکایت کیوں ہوتی۔ حالانکہ بعد میں تقسیم کے موقع پر شکایتیں پیدا ہوجاتی ہیں کہ یہ خرچ تم نے خود کیا، ہم نے کب کہا تھا یہ ہمارے حصہ میں کیوں لگایا جارہا ہے اور اگر کسی نے بوجہ شرم کے کچھ نہ کہا تو اس سے رضامندی نہیں ہوجاتی۔ اگر تم کو ایسا ہی روپیہ اڑانا ہے تو سب کا حق نکال کر ان کے حوالے کردو۔ پھر اپنے حصہ میں سے جو چاہو کرو، یا ان سے قرض لے لو اور بعد میں سب کا قرض ادا کردو مگر وہ قرض کاغذی ہی نہ ہو بلکہ واقعی قرض ہونا چاہیے ورنہ آخرت میں ماخوذ ہوگے۔

حدیث میں ہے کہ مقروض جنت سے محبوس رہتا ہے(۱) جب تک کہ اس

(۱) جنت میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

کا قرض ادا نہ ہو۔ یہ وعید ایسے ہی قرض کے بابت ہے جو محض کاغذی ہو جس کے ادا کرنے کی نیت نہ ہو نیز بلاضرورت ہو۔ باقی ضرورت کا قرض اس سے مستثنیٰ ہے۔ ضرورت کا قرض وہ ہے جس کے بغیر ضرر(۱) ہو، شکایت ہو، سورسوم نہ کرنے میں تمہارا کیا ضرر ہے۔

پھر مردہ کے کپڑے تقسیم کرنے میں سخاوت سے کام لیتے ہیں، قیمتی کپڑے بھی خیرات کردیتے ہیں حالانکہ بعض ورثاء ان کو خیرات کرنا نہیں چاہتے اور افسوس یہ ہے کہ لینے والے بھی تحقیق نہیں کرتے کہ جو کپڑے ہم لے رہے ہیں اس میں سب ورثاء راضی ہیں یا نہیں اور اپنا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ذمہ چھان بچھوڑا(۲) کرنا نہیں ہے۔ ان خدا کے بندوں کو عقل نہیں آتی، چھان بچھوڑ کی وہاں ضرورت نہیں جہاں شبہ نہ ہو، بلکہ قوی شبہ ہو وہاں اس کی ضرورت ہے کہ تفتیش سے کام لیا جائے، جس تفتیش کی ضرورت نہیں وہ یہ ہے کہ ایک شخص آپ کی دعوت کرے جس کی آمدنی بظاہر حلال ہے وہاں آپ یہ پوچھیں کہ گوشت کہاں سے آیا، دام کہاں سے آئے؟ یہ البتہ آپ کے ذمہ نہیں۔ لیکن جہاں شبہ قوی ہو وہاں ضرور تفتیش سے کام لینا چاہیے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ تحقیق کرے تو دوسرے اقرباء اس کی اس کوشش کو باطل کرتے ہیں۔

وراثت کا مال لینے میں احتیاط کا تقاضا

ایک موضع کا واقعہ ہے کہ ایک زمیندار ایک بی بی اور دو نابالغ لڑکیاں چھوڑ کر مرگئے۔ بی بی نے ان کے کپڑے یہاں بھیجے، یہاں سے یہ کہہ کر واپس کردیئے گئے کہ ان میں نابالغوں کا حق ہے۔ اتفاق سے وہاں ایک مولوی صاحب جو واقع میں بھی اچھے تھے وارد ہوئے۔ وہ کپڑے ان کے سامنے پیش کیے گئے اور

(۱) نقصان (۲) تحقیق کرنا نہیں ہے۔

یہاں کا عذر بھی بیان کر دیا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آخر ان لڑکیوں کی شادی میں بھی تو ماں کا ان لڑکیوں کے حق سے زیادہ ہی صرف ہو جائے گا اس لیے ماں ان کپڑوں میں تصرف کر سکتی ہے۔ پس اس تاویل سے قبول فرمالیا۔ یہ تو علماء کی حالت ہے کہ نہ خود تفتیش کریں اور نہ تفتیش کرنے والے کی تحسین کریں بلکہ اس کی کوشش کو مٹانا چاہتے ہیں۔

عوام کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے ایک قاعدہ کلیہ نکال لیا ہے کہ جب کسی مسئلہ یا عمل میں علماء کا اختلاف ہو تو جدھر زیادہ ہوں وہ حق ہے۔ نہ معلوم یہ قاعدہ کہاں سے نکالا ہے حالانکہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کثرت ادلہ سے ترجیح نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر ایک مقدمہ میں دو گواہ ایک طرف ہوں اور سو گواہ ایک طرف ہوں تو حاکم اسلام دونوں کو برابر سمجھے گا۔ یہ کوئی وجہ ترجیح نہیں کہ ایک طرف دو اور ایک طرف سو۔ البتہ شریعت میں اجماع حجت ہے مگر اجماع اس کا نام نہیں کہ ایک طرف زیادہ جماعت ہو تو بس وہ اجماع ہو گیا۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ ایک معتبر عالم کی مخالفت بھی قادح اجماع ہے(۱)۔

غرض علماء کے ان معاملات سے عوام کو جرأت ہوئی ہے اور وہ بھی احتیاط نہیں کرتے اور صاف کہتے ہیں کہ اگر یہ احتیاط ضروری ہوتی تو مولوی لوگ کپڑے لیتے ہوئے تفتیش کیوں نہ کرتے اسی طرح کسی سے کوئی چیز مانگ کر لا دیں گے تو جب تک وہ خود ہی نہ مانگے اس وقت تک دینا نہیں جانتے۔

بدون رضامندی کسی چیز کا استعمال جائز نہیں

کسی نے آپ کے یہاں کھانا بھیجا اور آپ کی خاطر سے چینی یا تانبے

(۱) اجماع کو توڑنے والی ہے۔

کے برتن میں بھیجا تو اب برتن کو واپس کرنا جانتے ہی نہیں، بے فکرے گھر میں ڈال دیتے ہیں اور مہینوں اس میں کھانا کھاتے ہیں۔ حالانکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جس برتن میں کھانا بھیجا جائے اس کھانے کو دوسرے برتن میں نکال کر کھانا چاہیے، اسی برتن میں کھانا ناجائز ہے۔ ہاں اگر وہ ایسا کھانا ہے جس کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے اس کی لذت جاتی رہے یا صورت بگڑ جائے تو اس کو اسی برتن میں کھانا جائز ہے جیسے فیرنی کو طشتری میں جما کر بھیجا تو اس کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے صورت خراب ہوجاتی ہے۔ فیرنی کا لطف یہی ہے کہ جس برتن میں اس کو جمایا گیا ہے اسی میں کھایا جائے، لوٹ پوٹ کرنے سے بدنما ہوکر اس کی طرف بے رغبتی ہوجاتی ہے، ہاں کوئی بہت ہی بھوکا ہو تو ہر حالت میں رغبت ہوسکتی ہے۔

جیسے ایک لطیفہ ہے کہ کسی عورت نے فیرنی پکا کر کسی طباق(۱) میں جمائی، خود کسی کام کو چلی گئی، چھوٹے بچہ کو نگرانی کے لیے بٹھا گئی، ایک کتا آیا اور ایک طرف منہ ڈال کر کھانے لگا۔ بچہ غافل تھا پھر اس کو ہٹایا، ماں آئی تو سب واقعہ سنایا۔ اس نے ایک دوسرے برتن میں فیرنی کو لوٹ کر بچہ سے کہا، جا مسجد کے ملا کو دے آ، اس نے جا کر حوالہ کی، ملاجی کو بھلا فیرنی کب نصیب ہوئی تھی، لیتے ہی فوراً ادھر ہی سے جدھر سے کھائی ہوئی تھی لگے ہاتھ مارنے، لڑکے نے کہا، ملاجی ادھر سے نہ کھانا، ادھر تو کتا منہ ڈال گیا تھا، ملاجی نے جو یہ قصہ سنا برتن کو اٹھا کر دور پھینکا کہ جا کم بخت! کتے کے آگے کا میرے واسطے، پھینکنے سے پیالہ پھوٹ گیا، لڑکا رونے لگا کہ میری ماں مجھے مارے گی، ملاجی نے کہا تجھے کیوں مارے گی، کہنے لگا، اس برتن میں میرے چھوٹے بھائی کا گوہ اٹھاتی تھی، ملاجی کو یہ سن کر اور غصہ آیا، لگے قے کرنے۔

تو کوئی ان ملاجی کی طرح بھوکا ہو، وہ تو البتہ فیرنی میں ہر طرح کے ہاتھ

(۱) بڑی پلیٹ۔

مارنے لگے گا ورنہ عموماً فیرنی کو اسی برتن میں کھایا جاتا ہے جس میں اس کو جمایا جاتا ہے۔ تو ایسی چیز کو بھیجنے والے کے برتن میں کھالینا جائز ہے ورنہ نہیں اور جو فقہاء نے قول کیا ہے ظاہر ہے کہ کسی کی چیز کا استعمال بدون رضامندی (۱) کے جائز نہیں اور برتن میں بھیجنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس میں کھانے کی بھی اجازت ہے، ہاں جس چیز کو دوسرے برتن میں لوٹنے سے اس کی ہیئت بگڑ جائے یا لطف جاتا رہے اس میں دلالۃً اس کی بھی اجازت ہے کہ میرے ہی برتن میں کھاؤ۔ پس اس مسئلہ کا مدار اس لم (۲) پر رکھتا ہوں۔ باقی صورت مسئلہ غالباً اس وقت کے عرف پر ہوگا۔ اس زمانہ میں کھانا بھیجنے والے اپنے برتن میں کھانے کی اجازت نہ دیتے ہوں گے لیکن ہمارے یہاں کا عرف یہ ہے کہ جو شخص کسی کے یہاں کھانا بھیجتا ہے اس کی طرف سے یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ اسی کے برتن میں کھالیا جائے، لیکن یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ کھانا کھا کر پھر دوسرے وقت بھی اسے استعمال کرے اور استعمال بھی مہینہ بھر تک۔ پھر غضب یہ کہ ایک گھر میں جب کسی کا برتن آجاتا ہے پھر وہ کسی کے یہاں کھانا بھیجنا چاہیں تو اپنے برتن میں نہیں بھیجتے بلکہ دوسرے کے برتن میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے کے یہاں جا کر عرصہ تک پڑا رہتا ہے۔ پھر غاصب الغاصب (۳) کے یہاں سے کوئی چیز اسی برتن میں اصل مالک کے یہاں گئی تو اس وقت آپس میں نزاع ہوتا ہے۔ اصل مالک کہتا ہے کہ یہ میرا برتن ہے، دوسرا کہتا ہے کہ واہ! یہ تو مہینوں سے ہمارے یہاں پڑا ہے، اب کسی کو یاد نہیں کہ یہ برتن کس کے یہاں سے آیا اور مالک کے گھر سے کس کے پاس گیا تھا، اب نزاع دور کرنے کے لیے ایمان کی قسم لی جاتی ہے، قرآن کی قسم لی جاتی ہے، بھلا یہ بھی کوئی معاشرت ہے۔

واللہ! بہت گندی معاشرت ہورہی ہے، ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے گھر

(۱) بغیر رضامندی (۲) ۔۔۔۔(۳) ایک غاصب کے یہاں سے دوسرے غاصب کے یہاں جاتا رہتا ہے اور سب کو غصب کا گناہ ہوتا ہے۔

والوں کو سختی کے ساتھ تاکید کیا کرے کہ جب کسی کے یہاں سے کھانا آیا کرے فوراً اس کا برتن ساتھ کے ساتھ واپس کر دیا کریں۔ بحمد اللہ مجھے اس کا بہت ہی اہتمام رہتا ہے جب تک دوسرے کا برتن واپس نہیں ہو جاتا مجھے چین نہیں آتا۔ یہ تو عوام کی حالت ہے۔

اہل علم کی یہ حالت ہے کہ کسی کی کتاب لے لی تو اب اس کو واپس دینے کا نام جانتے ہی نہیں۔ کتاب دینے والا اگر کثیر المشاغل ہو تو اس کو یاد بھی نہیں رہتا کہ مجھ سے کتاب کس نے مانگی تھی، بس مہینہ بھر کے بعد وہ سمجھ لیتا ہے کہ کتاب چوری ہوگئی اور لینے والا بے فکر ہوگیا کہ وہ تو مانگتا ہی نہیں۔ اب گویا وہ ان کی ملک ہوگئی۔ پھر ان میں بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی چیز تو دوسرے کی چھاتی پر سوار ہو کر لے لیتے ہیں اور دوسروں کی چیز دینے میں لاپرواہوتے ہیں اور بعضے دینے میں بھی لاپرواہ ہوتے ہیں اور اپنی چیز لینے میں بھی لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اس کو لوگ بزرگی سمجھتے ہیں کہ بڑا زہد ہے، ایسی تیسی ایسے زاہد کی۔ یہ شخص خدا کا مجرم ہے اپنی چیز کے وصول کرنے میں تو لاپرواہ ہونا عیب نہیں مگر دوسروں کی چیز واپس کرنے میں لاپرواہ ہونا بڑا گناہ ہے۔ آج کل لوگوں نے گویا بے ڈھنگے پن کا نام بزرگی اور زہد رکھ لیا ہے حالانکہ اہل اللہ بڑے منتظم ہوتے ہیں۔ دوسروں کا حق کبھی نہیں رکھتے۔

ہمدردی کرنے اور قرض دینے کا نتیجہ

اسی طرح بعض لوگ قرض میں گڑ بڑ کرتے ہیں کہ کسی کا روپیہ لے کر ایسا بھولتے ہیں کہ گویا دینے کا نام ہی نہیں جانتے۔ اپنے سارے کام اللے تللے(۱) سے چلاتے ہیں مگر قرض کے ادا کرنے کی فکر نہیں۔ اسی واسطے مسلمانوں میں ہمدردی نہیں رہی۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ موجود ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی کو قرض دے دیں۔ اپنے آپ حفاظت

(۱) خوب فراغت وفضول خرچی سے چلاتے ہیں۔

سے بچیں اور دوسرے کا کام نکل جائے مگر کس کو دیں۔ لوگ قرض لے کر دینے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اسی لیے قرض بے سودی آج کل نہیں ملتا کیونکہ اس کے ادا کی فکر نہیں ہوتی۔ ہاں بنیوں کا قرض خوب یاد رہتا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی تمسک لکھوا لیتے ہیں اور سودی قرض خوب دل کھول کر دیتے ہیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دو تین سال میں سود در سود ملا کر ایک ہزار کے چار ہزار وصول کرتے ہیں۔ بس اس سے سب خوش ہیں، استغفر اللہ العظیم۔ اگر لوگوں کو بے سودی قرض کا بھی ایسا اہتمام ہوتا جیسا سودی قرض کا ہوتا ہے تو آپس میں مسلمانوں ہی سے روپیہ مل جایا کرتا اور مسلمانوں کی جائیدادیں اس طرح ہندوؤں کے ہاتھ میں نہ پہنچتیں۔

امانت کے بارے میں بھی یہی گڑ بڑ ہے۔ کسی کے پاس امانت رکھو، مگر یہ کبھی اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ امانت کو بعینہ رکھے گا، اکثر لوگ امانت کا روپیہ اپنے کام میں خرچ کر دیتے ہیں۔ پھر چار پانچ سو کی امانت خرچ کر گئے اور اس کے ادا کی کچھ فکر نہیں۔ اب وہ روپیہ والا غریب ان سے مانگتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی وہ تو خرچ ہو گئے جب ہوں گے دیدیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب آپ نے امانت کے روپے کیوں خرچ کیے؟ جہاں سے ہو میری رقم ادا کیجئے تو کہتے ہیں کہ صاحب مجھ سے غلطی ہوگئی کہ میں نے ضرورت میں آپ کی رقم خرچ کر دی اب اس وقت میرے پاس نہیں، میں کہاں سے ہگ دوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم نہ ہگو مگر اس غریب روپے والے کا تو یہ سن کر پائخانہ نکل گیا ہوگا۔

چندوں کا غبن

سب سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ لوگ مسجدوں تک کا چندہ کھا جاتے ہیں۔ ایک شخص مسجد کے لیے چندہ کیا کرتا تھا جہاں تھوڑا بہت جمع ہو گیا اسے بیٹھ کر کھا پی لیا، پھر چندہ مانگنے لگا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ پہلا روپیہ کہاں گیا تو

قسم کھا کر کہہ دیتا کہ مسجد میں لگا دیا۔ اس کے ایک پڑوسی نے کہا کہ ظالم تو جھوٹی قسم تو نہ کھایا کر، مسجد میں تو کہاں لگاتا ہے تو آپ نے اس سے کہا کہ آؤ میرے ساتھ چلو، دکھلاؤں۔ پھر مسجد میں جا کر روپیہ کو دیوار سے لگا دیا اور کہا کہ اس پر قسم کھایا کرتا ہوں کہ مسجد میں لگا دیا بس دیوار سے روپیہ کو لگا دیتا ہوں۔

یہ حالت ہے آج کل چندہ کرنے والوں کی۔ اسلامی چندوں کا نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب، ہر شخص جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ یاد رکھو بعض کتب فقیہ میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلہ میں جو غالباً تین پیسہ کا ہوتا ہے سات سو مقبول نمازیں لی جائیں گی، دنیا میں گل چھرے اڑا لو آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔

واقعی ہندوستان کے چندہ دینے والے بڑی ہمت کے لوگ ہیں کہ ہمیشہ آئے دن چندے دیتے رہتے ہیں اور یہ لوگ سب کو دیتے ہیں۔ خیر ان لوگوں کو تو ثواب مل ہی جاتا ہے کیونکہ ان کی نیت تو اچھی ہی ہوتی ہے مگر چندہ لینے والے آخرت میں خوب سزا بھگتیں گے جو اس طرح بے دریغ مسلمانوں کا روپیہ برباد کرتے ہیں۔

ہاں! ایک صورت میں چندہ دینے والوں کو بھی ثواب نہیں ہوتا جبکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص جس کام کے لیے چندہ کر رہا ہے اس میں نہ لگائے گا۔ اس وقت دینے والوں کو بھی گناہ ہوگا کیونکہ اس شخص کو چندہ مانگنا حرام ہے اور لوگوں کے دینے سے اس کی جرأت بڑھتی ہے اور حرام کی اعانت بھی حرام افسوس! لوگ کس کس طرح مخلوق کو دھوکہ دیتے ہیں مگر یاد رکھو! خدا کے یہاں دھوکہ نہ چل سکے گا۔

زنہا رازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبیؐ را بدرودے (۱)

(۱) ''تم ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں''۔

مولانا فرماتے ہیں:

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام در غلط اندازی تا ہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہا اوراست باید داشتن رایت اخلاص وصدق افراشتن(۱)

مجھے خود ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک مقام پر ایک مدرسہ کا جلسہ تھا۔ اس میں میرا بیان تھا وہ زمانہ چندہ بلقان تھا۔ بعد جلسہ کے کسی نے مختصراً اس کی بھی تحریک کردی، اس پر ایک تحصیلدار پنشنر نے اس چندہ میں سو روپے دیئے۔ میں باہر جارہا تھا، چند آدمی ایک جگہ باتیں کرتے نظر آئے، دریافت پر یہ قصہ معلوم ہوا۔ میں نے جزاک اللہ کہہ دیا، بس یہ میرا جرم تھا، جس پر انہوں نے مجھ کو بعد میں پریشان کیا۔

قصہ یہ ہوا کہ ان تحصیلدار صاحب نے جن لوگوں کو چندہ دیا تھا ان کو مجبور کیا کہ میرے سو روپیہ کی رسید علیحدہ منگا کردو، انہوں نے اس درخواست کو لغو سمجھ کر کچھ توجہ نہ کی۔ جب وہ مایوس ہوگئے چونکہ میں نے جزاک اللہ کہا تھا، اس جرم میں وہ میرے سر ہوئے اور میرے پاس خط آیا کہ مجھے سو روپیہ کی رسید منگا دو، میں نے بواسطہ ایک دوست کو لکھا کہ جن کو تم نے چندہ دیا ہے ان سے رسید مانگو، مجھ سے کیا واسطہ! انہوں نے پھر مجھے لکھا کہ یا تو رسید منگا دو ورنہ روپیہ واپس دو، نہیں تو عدالت میں دعویٰ کروں گا۔ میں نے چندہ کرنے والوں کو لکھا کہ اس شخص کا روپیہ واپس کردو۔ معلوم ہوا کہ وہاں تو خرچ روانہ ہوگیا۔ میں نے دفع فتنہ کے لیے سو

(۱) ''میں نے فرض کیا کہ اگر تو نے تمام مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے۔ یعنی مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں، خداوند تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنے چاہئیں، اخلاص اور سچائی اور علم بلند رکھنا چاہیے''۔

روپیہ اپنے پاس سے ایک دوست کے پاس واپس بھیج دیئے کہ ان کو دیدیں مگر وہاں کے میرے دوستوں نے ان کو اپنے پاس سے رقم ادا کردی اور میری رقم واپس کرنا چاہی، میں نے انکار کیا، جب جانبین سے اصرار وانکار بڑھا، آخر سب کے اتفاق سے وہ رقم ایک نیک کام میں لگادی گئی۔

تو اس وقت ایک عالم صاحب نے مجھے رائے دی تھی کہ تم نے اپنے پاس سے کیوں دیا؟ اس مد میں اور چندہ بھی تو آرہا تھا، اس میں سے بھیج دیتے۔ میں نے کہا مجھے آپ کے اس فتویٰ پر حیرت ہے، یہ مجھے کہاں جائز ہے کہ میں دوسروں کا روپیہ اس شخص کو دوں، کیا لوگوں نے اس واسطے چندہ دیا ہے۔ بھلا آپ ہی سوچیں کہ اگر آپ چندہ میں روپیہ دیں اور میں اس کو اس طرح خرچ کردوں تو کیا آپ کو یہ گوارہ ہوگا، ہرگز نہیں۔ پھر دوسروں کی رقم میں آپ مجھے یہ رائے کس طرح دیتے ہیں؟ اور تعجب یہ کہ وہ عالم مدرس بھی تھے اور صاحب فتویٰ بھی تھے۔

دین کو مصالح کے تابع بنادیا گیا

اس طرح سے آج کل لوگوں نے دین کو اغراض ومصالح کے تابع بنارکھا ہے۔ ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک مدعی اجتہاد عالم صاحب نے ساس کو حلال کردیا۔ ایک شخص کو اپنی ساس سے تعلق ہوگیا تھا، کم بخت نے بیوی کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنا چاہا، علماء سے فتویٰ لیا۔ سب نے یہی کہا کہ ساس سے نکاح حرام ہے مگر ایک عالم نے ایک ہزار روپیہ لے کر فتویٰ دیدیا کہ حلال ہے مگر چونکہ ساس کا حرام ہونا نص قطعی سے ثابت ہے ''وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ'' اس سے آپ نے تاویل نکالی کہ آج کل عورتوں میں جہالت زیادہ ہے جس کی وجہ سے بعض کلمات ان کی زبان سے ایسے نکل جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایمان زائل ہوجاتا ہے تو اس کی

منکوحہ کی زبان سے ایسے کلمات نکلے ہوں گے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان نہیں ہوئی اس لیے منکوحہ سے اس کا نکاح درست نہیں ہوا، جب نکاح درست نہیں ہوا تو منکوحہ کی ماں اس کی ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہا حرمت مصاہرت کا مسئلہ سو یہ محض امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسئلہ ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔ حدیثیں اس کے خلاف ہیں۔

غرض اس نے گڑھ مڑھ کر ساس کو حلال کر دیا۔ محض اس لیے کہ اس کو ایک ہزار روپیہ ملتا تھا۔ کم بخت حرص نے اس عالم کو تحریف دین پر آمادہ کر دیا، یہ حرص بری بلا ہے۔ اس میں انسان جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔

ایک اور نکتہ قابل یاد رکھنے کے ہے۔ وہ یہ کہ حرص اہل اسراف(۱) کو زیادہ ہوتی ہے اور بخیل کو صرف اپنے مال کی حرص ہوتی ہے، دوسروں کے مال میں بخیل آدمی بڑا متقی ہوتا ہے وہ کسی کے مال کو ہاتھ نہیں لگاتا اور یہ اہل اسراف دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ آج کل اسراف کرنے سے بخیل ہونا اچھا ہے۔ اسراف کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ سو یہ ضرر لازمی ہے متعدی نہیں(۲)۔ اسی طرح بعض آدمی لوگوں سے ادھار لے کر ادا کرنا نہیں جانتے۔

مظفر نگر میں ایک شخص نے ایک سوداگر سے دس روپیہ قرض لیے کہ مجھے ضرورت ہے اس بیچارہ نے دیدیئے۔ پھر وہ حضرت روپیہ ہضم کر کے بیٹھ گئے، سوداگر نے تقاضا کیا تو پہلے پہل آپ نے ٹالا، پھر سال بھر کے بعد کہنے لگا کہ جاؤ، کیسا قرض لیے پھرتے ہو، کیا تمہارے پاس میری کوئی تحریر ہے؟ اگر ہے تو دکھاؤ ورنہ جاؤ، میں نہیں دیتا۔ اب وہ بے چارہ تحریر کہاں سے دکھاتا، اس نے تو ان کو اعتبار پر ویسے ہی روپیہ دیدیا تھا۔ اب اس شخص کی حرکت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ کے

(۱) فضول خرچی کرنے والوں کو (۲) یہ ذاتی نقصان ہے دوسرے کو اس سے نقصان نہیں پہنچتا۔

لیے اس نے قرض نہ دینے کا عہد کرلیا۔ غرض معاملات میں ایسی بے عنوانیاں کی جارہی ہیں کہ میں ان کو بیان نہیں کرسکتا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(سارا بدن داغ داغ ہے روئی کہاں کہاں رکھیں)

خواص کی خرابیاں

ایک دو باتیں ہوں تو بیان بھی کی جائیں۔ یہاں تو سر سے پاؤں تک حالت خراب ہورہی ہے، عوام وخواص سبھی کے معاملات گندے ہیں، خواص تک کی یہ حالت ہے کہ جب وہ کسی کے یہاں مہمان ہوتے ہیں تو کھانے کے وقت دوسرے لوگوں کو بلا بلاکر کھانے میں شریک کرتے ہیں۔ اول تو دوسرے لوگوں کو چاہے کہ کھانے کے وقت خود ہی وہاں سے الگ ہوجائیں لیکن اگر وہ الگ نہ ہوں تو مہمان کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ سب کو بلاکر شریک کرے۔ آخر تم کو کیا حق ہے کہ دوسرے کے دسترخوان پر بدون اس کی اجازت کے لوگوں کو بٹھلاؤ۔

رہا یہ کہ میزبان اس سے خوش ہوتا ہے اس کو ناگوار نہیں ہوتا، یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہر شخص اپنے مہمانوں کے انداز سے کھانا پکاتا ہے۔ جب زیادہ آدمی بیٹھ جائیں گے تو اس کو ضرور ناگوار ہوگا اور اگر اس کو ناگوار نہ ہو تو اس کے گھر والوں کو ناگوار ہوگا کیونکہ ان کو اپنے لیے از سرنو انتظام کرنا ہوگا بلکہ عورتوں کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے واسطے چولہا گرم نہیں کرتیں۔ اگر کسی وقت کھانا نہیں بچتا تو وہ خود فاقہ کرلیتی ہیں اور اپنے گھر والوں کی کلفت کسی کو گوارا نہیں ہوتی مگر اس کی خواص کو بھی پرواہ نہیں۔ وہ دسترخوان پر بیٹھ کر ساری مجلس کو شریک کرلیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاضرین کو نہ بلانا اور تنہا کھانا کھانا شرم کی بات ہے۔

افسوس! ان کو خدا سے شرم نہیں آتی، اگر ایسی ہی شرم ہے تو ان کو بازار سے اپنا دام خرچ کر کے کھانا منگانا چاہیے، پھر اختیار ہے کہ جتنے آدمیوں کو چاہو بلالو، مگر ان شاء اللہ جس دن ان سے ایسا کرنے کے لیے کہا جائے گا اس دن ایک کو بھی نہ بلائیں گے۔

ایک مرتبہ میرے یہاں ایک عالم مہمان تھے، گھر سے ان کے لیے کھانا گیا اور یہ قاعدہ ہے کہ مہمان کے سامنے کفایت کی مقدار سے کچھ زیادہ ہی بھیجا جاتا ہے۔ تو کھانا زائد دیکھ کر وہ عالم صاحب ایک دوسرے شخص کو جو میرا مہمان نہ تھا، کھانے میں شریک کرنے لگے، میرے ملازم نے کہا یہ کھانا آپ کی ملک نہیں بلکہ اس کی اباحت کی گئی ہے۔ جتنا آپ خود کھالیں باقی جو بچے گا وہ گھر میں واپس جائے گا، دوسرے کو اس میں شریک کرنے کا آپ کو حق نہیں تو وہ عالم کہنے لگے کہ میں گھر سے اور کھانا نہ منگاؤں گا، دونوں اسی میں سے کھالیں گے اور جتنا کھانا میرے واسطے گھر سے آگیا ہے اس میں مجھے اختیار ہے چاہے سب کھاؤں یا کچھ چھوڑ دوں یا کسی کو کھلا دوں۔ میرے ملازم نے کہا کہ گھر میں سے مہمان کے سامنے ہمیشہ زیادہ ہی کھانا آتا ہے کہ اس سے کم نہ پڑے۔ باقی اس میں مہمان کی تملیک نہیں کی جاتی ہے محض اباحت ہوتی ہے۔ اگر آپ خود سارا کھا جائیں اس کی تو اجازت ہے مگر دوسروں کو شریک کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں اور اگر آپ میری بات نہیں مانتے تو فلاں شخص سے (یعنی احقر) سے پوچھ لیجئے، کہنے لگے ہاں، پوچھوں گا۔

حالانکہ یہ مسئلہ بالکل ظاہر تھا۔ درسی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ پوچھنے ہی کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی ان عالم صاحب کو اس کا خیال نہ ہوا اور میرے ملازم کو بے حیا بن کر کہنا پڑا۔ پھر تماشا یہ کہ پوچھا بھی نہیں، آخر میں نے خود ہی

متنبہ کیا۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ اباحت میں کھانا مالک کی مِلک میں رہتا ہے، اگر مالک لقمہ اگلوانا چاہے تو اس کو اس کا بھی حق ہے۔ البتہ تملیک کی صورت میں وہ کھانا لینے والے کی مِلک ہوجاتا ہے جیسے تقریبات کے اندر کھانا گھروں میں بھیجا جاتا ہے، وہ مِلک ہے۔ باقی مہمانوں کے سامنے جو کھانا آتا ہے وہ اس کی ملک نہیں ہوتا وہ محض اباحت ہے کہ جتنا تم کھاسکو کھالو، باقی مالک کو واپس کردو، مگر آج کل بعض اہل علم تک کو بھی اس کا لحاظ نہیں۔

اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ یہ امور شرفاء کے اندر تو فطری ہوتے ہیں ان کو دوسرے کے مال میں تصرف کرتے ہوئے خود ہی حجاب آتا ہے اور چھوٹی قوموں کے اندر حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور اس وقت شرفاء نے علم دین کی طرف توجہ چھوڑ دی ہے۔ چھوٹی قوموں کے لوگ زیادہ پڑھتے ہیں تو ان کے اخلاق تو ایسے ہی ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ نے خاص خاص قوموں میں خاص خاص خاصیتیں رکھی ہیں۔ اسی لیے نواب سعادت علی خان کی عادت تھی کہ وہ بعض قوموں کو ملازم نہ رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ قومیں رشوت خور زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک شخص جو اسی قوم کا تھا اس کو ملازمت کی ضرورت ہوئی تو سعادت علی خان کو درخواست دی۔ انہوں نے وہی عذر کیا تو آپ نے اس قاعدہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ شعر لکھا:

نہ ہرزن زن ست ونہ ہر مرد مرد خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد(۱)

مطلب یہ تھا کہ تم جو ان قوموں کے سب لوگوں کو یکساں سمجھتے ہو یہ غلط ہے، سب برابر نہیں ہوتے۔ سعادت علی خان نے لطیفہ کے طور پر جواب میں لکھا لیکن

وقت خوردن ہمہ یکساں می شوند

''لیکن کھانے کے وقت سب برابر ہوتی ہیں''

(۱) ''نہ ہر عورت عورت ہے نہ ہر مرد مرد، اللہ تعالیٰ نے پانچوں انگلیاں برابر پیدا نہیں کیں''

یعنی تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا نے پانچوں انگلیاں برابر پیدا نہیں کیں، یہ درست ہے مگر کھانے کے وقت سب برابر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ لقمہ سب کے سروں کو برابر ملا کر ہی لیا جاتا ہے۔ پس میاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے۔

اصلاح اخلاق کی ضرورت

میں تو یہ کہتا ہوں کہ علماء کو اصلاح اخلاق کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ہمارے نواح میں ایک بزرگ کسی رئیس کے یہاں مدعو تھے۔ کھانے کے وقت ان کو بلایا گیا تو ان کے اہل مجلس سب ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ اس بارے میں گاؤں والے بہت اچھے ہوتے ہیں کہ کھانے کا نام سنتے ہی اٹھ بھاگتے ہیں۔ جب وہاں سب جا کر بیٹھے تو میزبان نے تواضع کے طور پر سب سے کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں، کھانا بہت ہے، کچھ لوگوں نے عذر کیا کہ ہم تو محض حضرت کے ساتھ چلے آئے تھے، ہم کھانا نہ کھائیں گے، میزبان خاموش ہو گیا تو وہ بزرگ صاحب فرماتے ہیں کہ جب ایک مسلمان محبت سے کہتا ہے تو تم انکار کیوں کرتے ہو۔ سبحان اللہ! کوئی اس غریب کے دل سے پوچھتا کہ وہ کیسی محبت سے کہہ رہا تھا، وہ تو محض اس غیرت کے لحاظ سے کہہ رہا تھا کہ جب یہ لوگ میرے گھر پر کھانے کے وقت آ گئے تو ان سے کھانے کے لیے نہ کہنا اور ان کی بات تک نہ پوچھنا عرفاً مذموم ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جس شخص نے دس پانچ آدمیوں کے کھانے کا انتظام کیا ہو وہ اتنے بڑے مجمع کو محبت سے کب مدعو کر سکتا ہے جو اس مثل کے موافق آ گئے ہوں ''مان نہ مان میں تیرا مہمان''۔

غرض ان بزرگ کے ارشاد سے سب لوگ ہاتھ دھو دھو کر بیٹھ گئے اور کھانا کم ہو گیا، بیچارے میزبان نے اپنے بھائی کے گھر سے منگایا وہ بھی کافی نہ ہوا، آخر

بازار سے منگایا، سب کے سامنے بے آبروئی ہوگئی کہ ان کے گھر سے کھانا نہ نکلا اور سخت بے لطفی ہوئی۔ بعد میں بعضوں نے خود ان بزرگ کی شکایت کی کہ ان کو خدا کا خوف نہیں آیا کہ اتنے بڑے مجمع کو دوسرے کے گھر پر لا کھڑا کیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

صاحبو! بے ڈھنگی بات سے سب کو تکلیف ہوتی ہے گو کوئی شرم ولحاظ کی وجہ سے ظاہر نہ کرے۔ مجھے خود ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک انجمن میں مجھے بلایا گیا تو میں نے سفر خرچ کے سوا کچھ نہ لیا اور کرایہ بھی تیسرے درجہ کا لیا۔ وہ بھی انجمن سے نہیں بلکہ خاص داعی کی رقم سے جو کہ پہلے ہی شرط ٹھہر چکی تھی، وہ مجھے زائد دینے لگے میں نے انکار کیا اور کھانے کے اندر بھی میں نے تکلف کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس برتاؤ سے انجمن والے بڑے خوش ہوئے اور میرے سامنے سیکرٹری انجمن نے ایک واعظ کی شکایت کی صاحب وہ تو ایک دن میں گیارہ روپے کے پان کھا گئے۔ گیارہ روپے کے پان ایک آدمی تو بھلا کیونکر کھا سکتا تھا، بس یہ ہوا کہ جتنے آدمی ان سے ملنے آئے ان سب کو خوب پان کھلائے۔ اس وقت تو کسی نے کچھ نہ کہا مگر بعد میں شکایت زبان پر آ ہی گئی۔

میں نے دل میں کہا کہ آپ جو مجھ کو زیادہ رقم دے رہے تھے اگر میں لے لیتا تو کل کو آپ میری بھی یہی شکایت کرتے اور واقعی میزبان کو جب کلفت ہوتی ہے تو شکایت دل میں آتی ہی ہے۔ اس لیے الحمد للہ کہ میں نہ پان کھاتا ہوں نہ چائے پیتا ہوں نہ ناشتہ کا عادی ہوں تاکہ میزبان کو کوئی کلفت نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ کھانے کے بعد یہ خیال کر کے کہ میزبان بے تکلفی سے خوش ہوگا، میں نے پان مانگ لیا مگر میزبان نے خوب ہی کیا کہ صاف جواب دیدیا کہ

ہمارے یہاں پان نہیں ہے، کوئی کھاتا نہیں ہے اور واقعی یہ پان کا خرچ بالکل ہی فضول ہے۔ اس میں میزبان کا اچھا خاصا خرچ ہوجاتا ہے اور احسان کسی پر نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں نے ایک ہی ٹکڑا کھایا تھا مگر سو آدمیوں کو ایک ایک ٹکڑا دینے میں میزبان کے تو روپے خرچ ہوجاتے ہیں، پھر کھانے کا وقت بھی مقرر ہے کہ دن رات میں دو وقت کھایا جاتا ہے، پان کا کوئی وقت ہی نہیں، میرے خیال میں بعض دفعہ پان کا خرچ کھانے سے بھی بڑھ جاتا ہے اس لیے اس کو بالکل ہی حذف کردینا چاہیے اور اگر کسی مہمان کے واسطے پان آئیں تو اس کو یہ جائز نہیں کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بھی کھلادے اور فرمائش کرکے ان کے لیے بھی پان منگائے۔ اس سے میزبان کو بعض اوقات ناگواری ہوتی ہے۔

اسی واسطے میری عادت ہے کہ جب میں سفر کرتا ہوں تو اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لیتا ہوں اور داعی کو پہلے سے اس کی اطلاع کردیتا ہوں تاکہ وہ آزاد رہے۔ داعی پر صرف میرا اور اس آدمی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بعض دفعہ رستہ میں اگر لوگ محبت کی وجہ سے ساتھ ہولیتے ہیں تو میں ان سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنا انتظام خود کریں جہاں میرا قیام ہوگا وہاں آپ قیام بھی نہ کریں بلکہ سرائے وغیرہ میں جہاں آسانی ہو وہاں ٹھہریں اور بازار سے اپنے کھانے کا انتظام کریں اور صبح وشام محض ملاقات کے لیے میرے پاس آجایا کریں جس سے میزبان کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ پھر اگر وہ از خود آپ کی دعوت کرے تو آپ اپنے تعلقات کو دیکھ کر دعوت منظور کریں یا رد کریں، میرے طفیلی بن کر کھانا نہ کھائیں۔

اور اگر کسی وقت میزبان مجھ سے کہنے لگتا ہے کہ آپ کے ان ہمرائیوں کی بھی دعوت میں کرنا چاہتا ہوں تو میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ اگر آپ کو دعوت کرنا ہو تو خود ان سے کہئے اور محض اپنے

تعلقات کی بناء پر جو چاہے کیجئے میرے اوپر اس کا احسان نہ ہوگا۔ میں ان سے کہنا نہیں چاہتا میری عام عادت یہی ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی مخلص ہوتا ہے تو وہاں میں اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ جونپور میں بہت سے لوگ میرے ساتھ ہوگئے اور سب اپنا اپنا انتظام بازار سے کرتے تھے۔ میزبان چاہتے بھی تھے کہ سب میرے ہی یہاں کھانا کھائیں مگر میرے ساتھیوں نے منظور نہ کیا۔ ایک عالم مجھ سے جھگڑنے لگے کہ صاحب آپ اپنے ساتھیوں کو فرمادیجئے کہ آپ ہی کے ساتھ کھانا کھائیں اس میں میزبان کی دل شکنی ہوتی ہے۔ میں نے کہا مولانا بس آپ خاموش رہیں، میں اس رسمی دل شکنی کو اس حقیقی کلفت سے سہل سمجھتا ہوں جو اتنے مجمع کے انتظام سے میزبان کو اور ان کے گھر والوں کو پیش آئے گی اور کس کس کو ناگواری بھی ہوگی۔

اب سنئے دوسروں کے گھروں پر تو مولانا کی یہ رائے تھی مگر جب خود دعوت کی تو صرف میری اور ساتھیوں میں سے اپنے ایک قدیم دوست کی دعوت کی، بقیہ ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہیں پوچھا اور عذر کرنے لگے کہ گھر میں علالت تھی اس لیے میں سب کو مدعو نہ کرسکا۔ میں نے دل میں کہا کہ دوسروں کے گھر پر رائے دیتے ہوئے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ شاید ان کے گھر پر بھی کوئی عذر ہو۔ پھر گھر نہیں پک سکتا تھا تو بازار میں تو پک سکتا تھا۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا کو میری دعوت کرنے کی ہمت بھی اسی لیے ہوئی کہ دیکھ لیا کہ میں ساتھیوں کو دعوت میں شریک نہیں کرتا۔ اگر سارے ساتھی میرے ساتھ دعوت میں شریک ہوا کرتے تو شاید وہ میری دعوت بھی نہ کرتے۔ اس لیے مشائخ وعلماء کو ان باتوں کا بہت ہی خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے سب ساتھیوں کا بار میزبان پر نہ ڈالا کریں۔

غرض اموال میں بہت کم احتیاط کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری

معاشرت نہایت خراب ہورہی ہے اوراس کا منشا وہی ہے کہ ہم دنیا کو دین پر اور آخرت پر مقدم کررہے ہیں۔

جاہ، مال سے زیادہ مرغوب ہے

اب ایک چیز رہ گئی جاہ، یہ مال سے بھی زیادہ مرغوب ہے کیونکہ جاہ کی حقیقت ملک قلوب ہے۔اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں جو کام ہزاروں روپے خرچ سے بھی پورے نہ ہوں وہ صاحب جاہ کے زبان ہلانے سے نکل جاتے ہیں اوراصل میں جاہ محض اس وجہ سے مطلوب ہے تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کی ایذاء سے بچارہے یعنی جاہ کا اصل نفع دفع مضرت ہے(۱) مگر آج کل اس کو جلب منفعت کے لیے آلہ(۲) بنایا جاتا ہے اوراس سے ہزاروں روپیہ کمایا جاتا ہے۔ غرض حب مال دنیا ہے تو حب جاہ دنیا کیوں نہ ہوگی۔حدیث میں ہے:

اذبان جائعان ارسلا فی مطیعة غنم افسدلها من حب المال والشرف للدین(او کما قال)(۳)

اس سے سمجھ لیجئے کہ حب جاہ دین کو کس قدر تباہ کردیتا ہے۔حقیقت میں جاہ حاصل کرنے کے لیے انسان وہ وہ کام کرگزرتا ہے جو تحصیل مال کے لیے بھی نہیں کرتا۔تحصیل جاہ میں دین کو اچھی طرح برباد کیا جاتا ہے۔رسوم وتقریبات میں ہزاروں روپیہ محض نام کے واسطے خرچ کیے جاتے ہیں، شادی اورغمی میں ایک شخص اپنی زمین وجائیداد تک بیچ ڈالتا ہے۔کوئی اس سے پوچھے کہ تونے کیا حاصل کیا، کچھ بھی نہیں، صرف ایک نام خریدا جو اگر بیچا جائے تو دوکوڑی کا بھی نہیں بک سکتا۔

(۱) نقصان سے بچنا (۲) نفع حاصل کرنے کا ذریعہ (۳) ''یعنی دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے گلہ کو اتنا تباہ وبرباد نہیں کرتے جتنا حب مال وحب جاہ دین کو تباہ وبرباد کردیتا ہے''۔

خیر یہ لوگ تو دنیا خرچ کر کے ایسی چیز خریدتے ہیں جس کو وہ خود بھی دنیا سمجھتے ہیں مگر بعض لوگ دین کی صورت بنا کر دنیا خریدتے ہیں۔ یہ ان سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ تو دنیا کو دنیا کی صورت سے حاصل کرتے ہیں، کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور یہ جماعت دنیا حاصل کرتی ہے، دین کی صورت میں۔ اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ وہ خود بھی دھوکہ میں رہتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم دین کا کام کررہے ہیں۔ چنانچہ تحصیل علم دین سب سے اعلیٰ چیز ہے مگر دیکھ لیجئے اس میں لوگوں کی کیا نیتیں ہیں۔ اکثر کی نیت محض دنیا ہی کمانا ہوتا ہے۔ گو علم دین سے دنیا بہت حاصل نہیں ہوتی ہاں گداگری آجاتی ہے کہ آئے دن مسلمانوں سے چندوں کا سوال ہوتا ہے جس سے بجائے عزت کے ذلت زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر پھر بھی بعض لوگ محض اس نیت سے علم حاصل کرتے ہیں کہ عالم بن کر ایک مدرسہ مستقل قائم کر کے اس کے لیے چندہ کریں گے اور بعض لوگ چندے بھی نہیں کرتے، ان کو مال اگرچہ کم ملتا ہے مگر جاہ زیادہ حاصل ہوتی ہے کیونکہ اب بھی مسلمانوں میں علماء کی قدر بحمداللہ بہت ہے۔ بشرطیکہ وہ علماء کی طرز پر رہیں، گداگری نہ کریں۔ گو وہ علماء کا طرز ریاء ہی سے اختیار کریں اور ان کی نیت علم حاصل کرنے سے یہی ہو کہ مخلوق کی نگاہ میں ہماری عزت ہوگی مگر اس طرز استغناء کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے خواہ مخواہ عالم کی قدر ہوتی ہے تو بعض لوگ علم پڑھنے سے اگر چندہ کرنے کی نیت بھی نہ کریں مگر حصول جاہ کی نیت کرتے ہیں تو یہ بھی دنیا ہی ہے۔

حب جاہ کے نتائج

مگر دین کی صورت میں اس علم کا انجام یہ ہوگا کہ حدیث میں ہے:

یجاء بالشهید یوم القیامة فات به فعرفه نعمه فعرفها قال ما علمت فیها قال قاتلت فی حتی استشهدت قال کذبت ولکنك قاتلت لان یقال فلان

جری فقد قیل ثم امر به فسحب علی وجهه حتی القی فی النار(۱)

یعنی شہید کو قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا پھر حق تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں بتلائیں گے جن کا وہ اقرار کرے گا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تو نے کیا عمل کیا، وہ کہے گا، اے پروردگار! میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا حتی کہ شہید ہوگیا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے، تو نے محض اس واسطے قتال کیا تھا کہ لوگ یوں کہیں کہ فلاں شخص بڑا بہادر ہے، دل کا مضبوط ہے، حاکم کے سامنے بڑی جرأت سے بیان دیئے، کسی سے نہیں ڈرا اور جیل خانہ میں خوشی کے ساتھ چلا گیا۔ سو دنیا میں تمہاری تعریف ہوچکی، پھر حکم ہوگا کہ اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دو۔

ثم یجاء بالقاری قد تعلم العلم وعلمه وقرأ القرآن فاتی به فعرفه نعمه فعرفها قال فما علمت فیها قال تعلمت العلم وعلمته وقرأت فیك القرآن قال کذبت ولکنك قرأت لیقال انك قاری فقد قیل ثم امربه فسحب علی وجه حتی التقی فی النار۔

پھر عالم کو لایا جائے گا جس نے علم حاصل کر کے دوسروں کو بھی پڑھایا تھا اور قرآن کو اچھی طرح پڑھا تھا۔ پس حق تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں جتائیں گے جن کا وہ اقرار کرے گا، پھر ارشاد ہوگا کہ تم نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا کیا، وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور لوگوں کو سکھایا اور آپ کی رضا کے لیے قرآن سیکھا۔ ارشاد ہوگا کہ تو جھوٹا ہے بلکہ تو نے محض اس لیے علم حاصل کیا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے، سو یہ سب کچھ ہوچکا، پھر اس کے لیے بھی وہی حکم ہوگا۔ چنانچہ منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ مولانا صاحب کی گت بنی جو بڑے نکتہ داں اور بڑے مدرس ومفتی تھے جن کے ہزاروں آدمی مرید ومعتقد تھے اور مصافحہ

(۱) الصحیح لمسلم کتاب الامارۃ: ۱۵۲، مشکوۃ المصابیح: ۲۰۵، تفسیر القرطبی: ۱/۱۸، بالالفاظ مختلفۃ۔

کے وقت ان کے ہاتھ پیر چومے جاتے تھے۔ ثم جاء بالجواد

پھر سخی کو بلایا جائے گا جس کو خدا تعالیٰ نے قسم قسم کی نعمتیں اور مختلف انواع کا مال عطا فرمایا تھا۔ حق تعالیٰ اس کے سامنے بھی اپنی نعمتیں گنائیں گے جن کا وہ اقرار کرے گا۔ پھر سوال ہوگا کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے کوئی موقع ایسا نہیں چھوڑا جہاں روپیہ کا خرچ کرنا آپ کو محبوب تھا مگر وہاں آپ کے لیے ضرور مال خرچ کیا۔ ارشاد ہوگا تو جھوٹا ہے بلکہ تو نے یہ سب کچھ محض اس لیے کیا تا کہ لوگ یوں کہیں فلاں شخص بڑا سخی ہے۔ پس تمہاری تعریف ہو چکی، پھر اس کے لیے بھی وہی حکم ہوگا۔ چنانچہ اس کو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

محض صورت دین کا نام دین نہیں

تو دیکھئے! شہید اور عالم اور سخی کی یہ گت کیوں بنی۔ محض اس لیے کہ انہوں نے خدا کے واسطے یہ کام نہ کئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض صورت دین کا نام دین نہیں بلکہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہونی چاہیے۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے(۱)

اگر محض صورت دین قابل اعتبار ہوتی تو قیامت میں شہید اور عالم اور سخی کی یہ گت نہ بنتی کیونکہ صورت دین کی تو ان کے پاس کمی نہ تھی مگر حقیقت دین سے وہ خالی تھے۔ یعنی اخلاص فی العمل سے اس لیے وہ صورت کچھ کام نہ آئی۔

صورت اور حقیقت میں فرق

صورت اور حقیقت میں ایسا فرق ہے جیسے ایک تو حقیقی شیر ہوتا ہے جس کی صورت سے تو کیا آواز اور بوتک سے تمام جانور کانپ جاتے ہیں اور جنگل کا جنگل تھرا جاتا ہے اور ایک مصنوعی شیر ہوتا ہے جیسے بعض جگہ محرم کے مہینہ میں

(۱) ''اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتے تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل یکساں ہوتے''۔

لوگ شیر کی کھال پہن کر شیر بنتے ہیں۔ وہ ایسا شیر ہوتا ہے کہ اگر سامنے سے بھیڑیا یا باؤلا کتا آجائے تو یہ شیر صاحب سب سے پہلے دم دبا کر بھاگیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو دین کی صورت میں دنیا حاصل کرتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

اینکہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند(۱)

جس طرح وہ مصنوعی شیر حقیقت میں شیر نہیں بلکہ غلاف شیر ہے اسی طرح دنیا بصورت دین حقیقت میں دین نہیں بلکہ محض غلاف دین ہے جیسے کوئی بدشکل بڑھیا عورت جوان عورتوں کا بھیس بدل کر عمدہ لباس پہن کر ایک مرد سے شادی کرے۔ ظاہر میں وہ جوان ہوگی لیکن جب لباس اتار کر دیکھا تو ماں کی بھی ماں نکلی۔

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں باز کنی مادر مادر باشد(۲)

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بدون اخلاص کے دین کے کام کرتے ہیں:

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بربایزید واز درونت ننگ میدارد یزید(۳)

صورت وحقیقت دونوں ضروری

مگر اس کا یہ مطلب نہیں صورت بالکل بیکار ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ محض صورت کافی نہیں بلکہ صورت کے ساتھ حقیقت بھی ہونی چاہیے۔ دیکھو اگر کوئی یہ کہے کہ مٹی کا بنایا ہوا آم بیکار ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آم کی صورت مطلقاً بیکار ہے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس صورت کے ساتھ اگر حقیقت بھی آم کی ہو اس وقت تو یہ صورت بھی اچھی ہے ورنہ مٹی کی صورت کو کوئی لے کر کیا کرے۔ چنانچہ

(۱) ''انسان یہ جو تم خلاف آدم دیکھتے ہو یہ انسان نہیں انسانوں کے غلاف میں ہیں'' (۲) ''سر پر نقاب ہونے سے خیال تھا کہ حسین وجمیل ہوگی مگر جب اس نے چادر اٹھائی تو معلوم ہوا کہ یہ تو ماں کی بھی ماں ہے'' (۳) ''باہر سے کافر کی قبر ہر طرح مزین اور اندر سے خدائے ذوالجلال کا عذاب ہو رہا ہے باہر ہے تو بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے''۔

حقیقی آم میں اس کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے جہاں اس کی شیرینی اور لطافت کی تعریف کی جاتی ہے وہاں اس کی شوخی رنگ اور چھلکے کی باریکی کی بھی تعریف ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص ایک نہایت حسین عورت کا فوٹو آپ کو دے تو اس کو آپ فضول سمجھیں گے لیکن اگر ویسی ہی حسین عورت زندہ آپ کو مل جائے تو اس وقت آپ صورت کو ہرگز بیکار نہ سمجھیں گے۔

اسی طرح سمجھو کہ دین کی صورت بھی مطلوب ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ حقیقت دین بھی ہو جائے۔ اگر حقیقت دین کے ساتھ صورت دین نہ ہو جیسے بہت لوگ باطن کے اچھے ہوتے ہیں ان کے دل میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تواضع واخلاق سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر ظاہر میں صورت شرع کے خلاف ہوتی ہے تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص تصرف کر کے اپنی روح کو کتے کے قلب میں حلول کر دے۔ بعض لوگوں کو تصرف کی مشق سے یہ قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی روح کو دوسرے حیوانات کے اجسام میں منتقل کر دیتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی روح انسانی کو کتے کے قلب میں منتقل کر دے گا تو اس وقت وہ کتا ہی ہوگا انسان نہ ہوگا۔ گو روح انسان کی ہوگی مگر کوئی شخص بھی اس کو آدمیوں کے برابر بٹھلانا گوارا نہ کرے گا۔

اس مثال سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ صورت کی بھی ضرورت ہے اور حقیقت کی بھی۔ نہ صورت بدون حقیقت کے کافی ہے نہ حقیقت بدون صورت کے کافی ہے۔ گو اس عدم کفایت میں تفاوت ضرور ہے کہ صورت بدون حقیقت کے زیادہ بری ہے اور حقیقت بدون صورت کو گو اتنی بری نہیں مگر بری وہ بھی ہے۔ خوب سمجھ لو۔

روح اور جسم کا تعلق

اس جگہ بعض طالب علموں کو ایک شبہ پیدا ہوگا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آیا

ہے کہ شہداء کی ارواح جنت میں حواصل طیور خضر میں ہوں گی اور تقریر سابق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر انسان کی روح کسی حیوان کی روح میں منتقل ہوجائے تو اس وقت وہ انسان نہ ہوگا بلکہ حیوان ہوگا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شہداء جنت میں انسان نہ رہیں گے بلکہ پرندے بن جائیں گے اور یہ فضیلت کے منافی ہے کیونکہ انسان پرندے سے افضل ہے۔ پس اس کا پرندہ بن جانا اس کے تنزل کا سبب ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں وہ جسم طیر شہداء کے لیے مرکب ہوگا(۱) ان کا حقیقی جسم وہ نہ ہوگا بلکہ ان کے لیے جسم انسانی دوسرا ہوگا۔ پس ارواح شہداء کا حواصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں ہم بہلی اور بگھی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں(۲)۔ اگر پالکی اور بگھی بند ہو تو دیکھنے والے کو یہی معلوم ہوگا کہ پالکی اور بگھی آرہی ہے، ہمارا جسم اس کو نظر نہ آئے گا مگر اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے گا کہ بگھی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری روح اس کے اندر حلول کئے ہوئے ہے بلکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس کے اندر جو آدمی بیٹھا ہے اس کا جسم بگھی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ محض اس کی سواری ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں روح شہداء کے لیے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہوگا اور اس کے اندر روح انسانی اپنے جسم انسانی کے ساتھ سوار ہوگی۔ پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی ہے کہ روح انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہوکر جسم طیر میں حلول کرتی اور وہاں یہ بات نہ ہوگی۔

عالم برزخ (قبر) میں جسم مثالی

اب رہی یہ بات کہ جسم انسانی کونسا ہے جس کے اندر شہداء کی روحیں حلول کر کے حواصل طیور خضر میں سوار ہوں گی۔ آیا وہ یہی جسم عنصری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے؟

(۱) پرندے کا جسم شہید کے لیے سواری ہوگا (۲) یا جیسے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہیں جو مثل پرندے کے اڑتا ہے۔

اس کی تحقیق کے لیے کشف کی ضرورت ہے کیونکہ نص اس سے ساکت ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہے کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسم عنصری کے مشابہ ہے مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے لیکن یہ جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہوگا اور جنت دوزخ میں یہی جسم عنصری پھر مل جائے گا۔ گو برزخ میں جسد عنصری کا ہونا کچھ محال نہیں مگر خلاف مشاہدہ ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب وثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ملحدین کا یہ اعتراض رفع ہوگیا کہ احادیث میں جو عذاب وثواب قبر کا ذکر ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ہم نے انسان کے مرجانے کے بعد اس کے جسم عنصری کا مہینوں پہرہ دیا ہے ہم کو تو کچھ بھی عذاب وثواب نظر نہیں آیا۔

جواب یہ ہے کہ برزخ میں انسان کو دوسرا جسم عطا ہوتا ہے جو کہ جسم مثالی ہے۔ عذاب وثواب اسی کو ہوتا ہے۔ لہٰذا جسد عنصری پر عذاب وثواب محسوس نہ ہونے سے اس کی مطلقاً نفی نہیں ہوسکتی پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے اس جسم عنصری پر بھی عذاب وثواب کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات منقول ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مردہ کی قبر میں آگ جلتی ہوئی دیکھی، بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی۔ لہٰذا اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں ہے، خوب سمجھ لو۔

ظاہر و باطن دونوں ضروری

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ ظاہر کے ساتھ باطن کی بھی ضرورت ہے اور باطن کے ساتھ ظاہر کی ضرورت ہے۔ بعض جاہل درویشوں کو یہ غلطی پیش آئی ہے کہ انہوں نے باطن کا اس درجہ اہتمام کیا کہ اصلاح ظاہر کو بیکار وفضول سمجھنے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ نماز کی روح ذکر ہے۔ پھر دعویٰ کیا کہ ہمارا باطن ہر دم ذاکر

ہے اس لیے ہم کو نماز کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی روح تزکیہ باطن ہے کہ دل کو حرص وبخل سے پاک کیا جائے، پھر کہنے لگے کہ ہمارے اخلاق مہذب ہو چکے ہیں ہم کو زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں۔ علیٰ ہذا حج کی روح تجلی الوہیت کا مشاہدہ(۱) ہے اور ہم کو تجلی الوہیت کا مشاہدہ ہر جگہ حاصل ہو جاتا ہے اس لیے حج کی بھی ضرورت نہیں۔

یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے(۲) ان لوگوں نے اعمال شرعیہ کی روح کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر وہ ان اعمال کی حقیقی ارواح کو دیکھ لیتے تو پھر ان اعمال کی صورت کو بیکار نہ سمجھتے کیونکہ ہر عمل کی روح کو اس کی صورت کے ساتھ ایسا خاص تعلق ہے کہ وہ بدون اس کے کبھی حاصل نہیں ہوسکتی، نماز کی روح مطلق ذکر نہیں ہے جیسا کہ ان لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ ایک خاص ذکر ہے جس کا تحقق اسی صورت صلوٰۃ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح حج کی روح مطلق مشاہدہ تجلی الوہیت نہیں ہے بلکہ خاص وہی مشاہدہ ہے جو بدون افعال حج کے حاصل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بعض دوائیں بالخاصہ مفید ہوا کرتی ہیں کہ وہ خاصہ ان ہی میں ہوتا ہے کسی دوسری دوا سے وہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ گو وہ درجہ حرارت و برودت(۳) میں اس کے بالکل برابر ہی ہو۔ خوب سمجھ لو۔ (میں نے اس مسئلہ کو ایک وعظ میں نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا نام روح الارواح ہے)۔

اس لیے میں پھر کہتا ہوں کہ نہ ظاہر باطن سے مغنی(۴) ہے نہ باطن ظاہر سے بلکہ دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے۔ یہ مضمون ظاہر وباطن کے متعلق درمیان میں ایک مناسبت سے مذکور ہوگیا۔ میں اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض لوگ دنیا کو دین کی صورت میں حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ بہت لوگ علم دین حاصل کرتے ہیں جو ظاہر میں آخرت کا کام ہے دنیا کا کام نہیں مگر ان کی نیت جاہ ومال حاصل کرنے کی

(۱) اللہ کی تجلی معبودی کا مشاہدہ ہے (۲) یہ تو صریح خدا کی توحید کا انکار ہے (۳) سرد وگرم ہونے میں برابر ہوں (۴) بے نیاز۔

ہوتی ہے اس لیے ایسے علم کو دنیا ہی کہا جائے گا۔ یہ ہے تحصیل دنیا بصورت دین۔

اخلاص کی ضرورت

دین کا کام خاص وہ علم ہے جس میں اخلاص ہو جس کی آج کل بہت ہی کمی ہے۔ علامہ شعرانی نے اخلاص کی ایک علامت لکھی ہے وہ یہ کہ جو کام تم کررہے ہو اور اگر کوئی دوسرا اس کام کا کرنے والا تم سے اچھا اس بستی میں آجائے اور وہ کام ایسا ہو جو علی العین (۱) واجب نہ ہو جیسے مسجد و مدرسہ کا اہتمام یا وعظ کہنا، پیری و مریدی کرنا، کسی نیک کام کے لیے چندہ کرنا وغیرہ وغیرہ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو۔ بلکہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو کہ وہاں جاؤ وہ مجھ سے بہتر ہیں اور سارا کام خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر کے خود ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤ اور دل میں خدا کا شکر کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیج دیا جس نے تمہارا کام بٹوالیا۔ اگر یہ حالت ہو تب تو واقعی تم مخلص ہو۔

مگر اب تو کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا آئے جس کی طرف عوام کا رجوع ہونے لگے تو جلے مرتے ہیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی بات ایسی ظاہر ہو جس سے عوام بدگمان ہو جائیں کہ

دو شمشیر درنیا مے نہ گنجند

اسی طرح

دو عالم در مقامے نہ گنجند

''دو تلواریں ایک نیام میں نہیں آسکتیں اسی طرح دو عالم ایک مقام پر اکٹھے نہیں ہو سکتے'' گویا اپنے کو وحدہ لاشریک لہ سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری ہی طرف رجوع کرنا چاہیے کسی اور طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ قبلہ و کعبہ تو ہم ٹھہرے پھر

(۱) جو کسی خاص شخص معین پر واجب نہ ہو۔

دوسری طرف نماز کیسی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو بلکہ اخلاص سے مفلس ہو۔

اور لیجئے ایک مولوی صاحب کا کسی مدرسہ میں قیام ہے جب اس کا سالانہ جلسہ ہوتا ہے تو آپ کو ایک خاص حظ آتا ہے(۱) اور سمجھتے ہیں کہ یہ حظ دینی ہے کیونکہ نفس کہتا ہے کہ مجھ کو محض دین کا کام جاری ہونے اور طلبہ فارغین کو سند فراغ ملنے کی خوشی ہورہی ہے۔ اپنی کاروائی ظاہر ہونے کی خوشی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا ایک امتحان ہے وہ یہ کہ اگر یہ حضرت مولوی صاحب اس مدرسہ سے الگ کردیئے جائیں اور کوئی دوسرا ان کی جگہ پڑھانے لگے پھر اس کے فارغ کردہ طلبہ کو سند فراغ دی جائے اور اس کے لیے جلسہ کیا جائے تو ان مولوی صاحب کو اس وقت بھی یہ ہی حظ آئے گا یا نہیں؟ ایمانداری سے اپنے دل میں ٹٹول لیں، اگر اس وقت بھی ان کو ایسا ہی حظ آئے تو واقعی یہ دینی حظ ہے ورنہ سمجھ لو کہ یہ حظ محض دنیوی ہے جس میں ریاء وعجب کی آمیزش ہے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ کسی مدرسے سے علیحدہ کئے جانے کے بعد یہ مولانا صاحب اس مدرسہ کی تخریب ہی کے درپے نہ ہوں تو یہ ان کی بڑی عنایت ہے۔ آئندہ اس کے جلسوں سے حظ آنا اور مسرت وخوشی ہونا تو بہت دور ہے۔

مجھے خود ایسے واقعات بہت پیش آتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب کسی مدرسہ میں ملازم ہیں۔ جب تک وہ وہاں رہیں گے برابر میرے پاس خطوط بھیجتے رہیں گے کہ یہاں آپ کے آنے کی بہت ضرورت ہے اس جگہ جہالت وبدعت زیادہ ہے۔ پھر جب مولانا کی وہاں سے بدلی ہوگئی تو اس جگہ کی بدعت وجہالت سب رخصت ہوگئی۔ اب وہاں کسی جلسہ اور وعظ کی کچھ ضرورت ہی نہیں رہی بلکہ اب جس جگہ مولانا بدلی ہوکر پہنچے وہاں کا چاند بدلی میں آگیا۔ اب ساری بدعت و

(۱) لطف آتا ہے۔

جہالت وہاں آ گئی اور اس جگہ کے لیے وعظ وجلسہ کی ضرورت ظاہر ہونے لگی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری بدعت اور جہالت کی پوٹ خود ان مولوی صاحب کی ذات بابرکات ہے کہ جہاں آپ پہنچتے ہیں وہیں بدعات وجہالات کا زور ہوجاتا ہے اور وعظ وجلسہ وغیرہ کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے، کچھ نہیں، نہ پہلی جگہ جلسہ اور وعظ بدعت وجہالت کی اصلاح کے لیے کیا جاتا تھا نہ دوسری جگہ اس غرض کے لیے جلسہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جس جگہ مولانا صاحب کا قیام ہے اس مدرسہ سے آپ کی تنخواہ میں کمی نہ آئے بلکہ ترقی ہوتی رہے ورنہ اگر بدعت وجہالت کی اصلاح کے لیے جلسے کئے جاتے تو سب سے پہلے ان مقامات کی فکر ہوتی جہاں کے مسلمانوں کو کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ ان کی صورتیں ہندوؤں جیسی ہیں اور بیاہ شادی سب ہندوؤں کی طرح ہوتی ہیں کیونکہ ان مقامات پر تبلیغ کرنا فرض ہے مگر اب تو ہم لوگ اسی جگہ جاتے ہیں جہاں ہماری آؤ بھگت ہو، ایسے مقامات پر کون جائے جہاں کے مسلمان ہمیں پانی پینے کے لیے برتن بھی نہ دیں کیونکہ وہ ہم سے ویسے ہی چھوت چھات کرتے ہیں جیسے ہندو کرتے ہیں۔ افسوس!۔

نفس کا کید خفی

صاحبو! یہ نفس کا کید خفی ہے(۱) کہ ہم اپنے مدرسہ کے جلسہ سے خوش ہونے کو دینی مسرت سمجھتے ہیں، یہ نفس بڑا ہوشیار ہے، بعض دفعہ یہ ایسی پٹی پڑھاتا ہے کہ خود صاحب نفس کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس میں نفس کا کید تھا۔ چنانچہ اس مقام پر بعض اوقات نفس دھوکہ دیتا ہے کہ اپنی کارگزاری پر اس لیے زیادہ مسرت ہوتی ہے کہ اس فعل کا ہم کو ثواب ملا، غیر کے فعل کا ثواب ہم کو نہیں ملتا اس

(۱) پوشیدہ دھوکہ۔

لیے اس کی مسرت اس قدر نہیں ہوئی۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ اگر ایسے اسباب جمع ہوجائیں کہ فعل تو ان کا ہو مگر انتساب ہوجائے دوسرے کی طرف تو کیا اس وقت بھی ویسی ہی مسرت ہوتی ہے۔

غرض ہماری حالت یہ ہے کہ کوئی تو دنیا کو دنیا کی صورت سے حاصل کر رہا ہے اور اس میں ایسا منہمک ہے کہ آخرت کی اسے کچھ پرواہ نہیں اور کوئی دنیا کو دین کی صورت سے حاصل کر رہا ہے ایسا شخص اپنے کو دیندار سمجھتا ہے مگر حقیقت میں یہ بھی دنیادار ہے۔ حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ (۱)

مطلق طلب دنیا کی ممانعت نہیں

یہاں چند نکتے سمجھنے کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے اس جگہ ''بَلْ تُؤْثِرُوْن'' فرمایا ہے جو ایثار سے مشتق ہے جس کے معنی ایک چیز کو دوسرے پر ترجیح دینے کے ہیں اور اس کے بجائے ''بل تطلبون یا بل تتبغون'' نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ مطلق طلب دنیا پر شکایت نہیں بلکہ شکایت اس پر ہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جائے تو اگر کوئی شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دے بلکہ دونوں کے تزاحم کے وقت (۲) آخرت ہی کو ترجیح دے لیکن اس کے ساتھ وہ دنیا کمانے میں مشغول رہے تو اس کی مذمت نہیں ہے۔ اس میں زاہدان خشک (۳) کی اصلاح ہے جو مطلق طلب دنیا کو مذموم سمجھتے ہیں۔ بس خوب سمجھ لو کہ ترجیح دنیا علی الآخرت (۴) کی ممانعت ہے مطلق طلب دنیا کی ممانعت نہیں ہے۔

اب لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شادی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ کیسے

(۱) ''کہ تم فلاح کے لیے کوشش نہیں کرتے بلکہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو'' سورۃ الاعلیٰ: ۱۶، ۱۷
(۲) ٹکراؤ کے وقت (۳) خشک صوفیوں کی (۴) دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی ممانعت ہے۔

بزرگ ہیں جو بیوی رکھتے ہیں۔ بزرگوں کو بیوی کی کیا ضرورت ہے۔ سبحان اللہ! بس بزرگوں کو فرشتہ ہونا چاہیے کہ نہ کھائیں نہ پئیں نہ بیوی کریں۔

ایک مرتبہ میں میرٹھ گیا، گھر میں سے میرے ساتھ تھیں کیونکہ ان کے معالجہ کی ضرورت تھی اور وہ معالجہ قصبہ میں نہ ہوسکتا تھا۔ شہروں ہی میں ہوسکتا تھا۔ قصبہ میں بعض اسباب علاج میسر نہیں ہوتے جو شہروں میں میسر ہوسکتے ہیں۔ وہاں ایک بی بی نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی تو ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ تو ان سے مرید نہ ہو، یہ تو بیوی کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں، ہمارے پیر صاحب سے مرید ہوجانا، انہوں نے پچاس سال سے اپنی بیوی سے بات تک نہیں کی، وہ بی بی کچھ مسائل سے واقف تھی، اس نے جواب دیا کہ جس پیر نے پچاس سال تک بیوی سے بات نہیں کی وہ تو پچاس سال تک خدا کا مجرم رہا کہ اتنے عرصہ تک بیوی کے حقوق ضائع کرتا رہا، وہ ولی کیا ہوتا وہ تو فاسق ہے۔ غرض آج کل بیوی کو ساتھ رکھنا بھی دنیا میں داخل کیا جاتا ہے۔

عادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع

اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ جو ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ آٹھ آنہ گز کا کپڑا پہنتے ہیں، گیہوں کھاتے ہیں، جو کی روٹی نہیں کھاتے حالانکہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عادۃً کھایا ہے یا عبادۃً۔ ظاہر ہے کہ عبادۃً نہیں کھایا۔ پھر عادت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع شرعاً واجب نہیں نہ ان کے ترک میں کوئی گناہ ہے۔ عادات میں مزاج وغیرہ کے لحاظ کرنے کا اختیار ہے۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض عادات ایسی ہیں جن کو ہم

برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے شریعت نے عادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع واجب نہیں کیا، ہاں اگر کسی کو ہمت ہو اور عادات پر عمل کرنا بھی نصیب ہوجائے تو اسکی فضیلت میں شک نہیں مگر اس کو دوسروں پر طعن کرنے کا بھی حق نہیں۔

جَو کی روٹی پر مجھے قصہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی آج سے سنت کے موافق جَو کی روٹی کھایا کریں گے۔ چنانچہ جَو کا آٹا پسوایا گیا اور اس کو چھلنی میں نہیں چھانا گیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹے میں پھونک مار دیا کرتے تھے، جتنی بھوسی پھونک مارنے سے اڑگئی وہ اڑگئی، باقی کو گوندھ لیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا، اب جو وہ روٹی کھائی گئی تو سب کے پیٹ میں درد ہوگیا۔

اب ان کا ادب دیکھئے کہ یہ نہیں فرمایا کہ سنت کے اتباع سے ایسا ہوا بلکہ یہ فرمایا بھائی ہماری غلطی تھی جو ہم نے برابری کا دعویٰ کیا اور اپنے کو اس سنت کے قابل سمجھا، ہم اس کے قابل نہ تھے اس لیے ہم کو تکلیف ہوگئی۔ بس اس سنت پر وہی عمل کرسکتا ہے جو اس درجہ کا ہو، ہم اس درجہ کے نہیں ہیں۔ سبحان اللہ! ادب اسے کہتے ہیں۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ زمین پر سویا کرتے تھے۔ اب آج کل طبائع ایسی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں سو سکتے۔ نیز بعض لوگ ایسے ہیں جو زیتون کا تیل اور چربی نہیں کھا سکتے۔ اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے تو ان سنتوں کا اتباع ضروری نہیں کیونکہ یہ سنن عادیہ ہیں اور عادات میں ہر شخص کو اپنے مزاج کی رعایت کا شرعاً اختیار ہے۔ اسی طرح ملازمت اور کھیتی کرکے دنیا طلب کرنا حرام نہیں۔ چنانچہ آیت میں ﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾(۱) فرمانا اور بل تطلبون وغیرہ

(۱) مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو' سورۃ الاعلیٰ:۱۶

نہ فرمانا اس کی دلیل ہے اس کے علاوہ احادیث وافعال صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ان اعمال کا جواز بخوبی ثابت ہے۔

شیوخ کاملین کی حالت

شیوخ کاملین کی حالت یہی ہے کہ وہ ضعفاء کو قطع تعلقات مباحہ کا امر نہیں فرماتے (۱) ملازمت اور تجارت وزراعت کی بے تکلف اجازت دیتے ہیں۔ عمدہ غذاؤں کے کھانے سے منع نہیں کرتے، نہ زیادہ سونے سے روکتے ہیں، نہ بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی دل لگی کرنے سے منع کرتے ہیں، نہ کم کھانے کا حکم دیتے ہیں بلکہ وہ ہر شخص کی حالت کے موافق علاج کرتے ہیں جس کو دیکھتے ہیں کہ اسے کم کھانے سے ضرر نہ ہوگا اسے تقلیل غذا کا اعتدال کے ساتھ امر کرتے ہیں اور جس کو دیکھتے ہیں کہ خود ہی کمزور ہے اگر غذا کم کرے گا تو وہ اور زیادہ کمزور ہوجائے گا اسے بجائے تقلیل (۲) غذا کے مقویات اور دودھ گھی کھانے کا حکم دیتے ہیں۔

وہ شیخ اناڑی ہے جو سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکے۔ بعض مشائخ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو آتا ہے اسے تقلیل غذا اور تقلیل نوم (۳) وغیرہ کی تاکید کرتے ہیں چاہے کسی کا دماغ ہی خشک ہوجائے۔ مولانا ایسے ہی مشائخ کو فرماتے ہیں:

چار پارا قدر طاقت بار نہ برضعیفان قدر ہمت کارنہ
طفل راگرناں دہی برجائے شیر طفل مسکین را ازاں ناں مردہ گیر (۴)

یعنی بچوں کو اگر تم بجائے دودھ کے روٹی کھلانے لگو تو وہ بیچارہ تو چار دن

(۱) جائز تعلقات کو ختم کرنے کا حکم نہیں دیتے (۲) غذا کم کرنے کے بجائے طاقت ور غذا کھانے کا حکم دیتے ہیں (۳) کم کھانے اور کم سونے کا حکم کرتے ہیں (۴) ''چوپایوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ مت لادو، اور شیر خوار بچے کو اگر دودھ کے بجائے نان دیا جائے گا تو وہ مرجائے گا، اسی طرح کمزوروں پر ان کی ہمت سے زیادہ کام نہ ڈالو، یعنی وردووظائف نہ بتلاؤ''۔

میں ہلاک ہوجائے گا۔ پس ہر شخص کو اس کے تحمل کے موافق کام بتلانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ہر شخص کو ملازمت چھوڑا کر پہلے ہی دن تارک بنانا شروع کردو۔ عارف شیرازی ایسے ہی اناڑی شیوخ کو لتاڑتے ہیں:

خستگاں راچوں طلب باشد ہمت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود(۱)

دیوان حافظ کا مرتبہ

لوگ دیوان حافظ کو معمولی کتاب سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں تمام تر سلوک ہی سلوک بھرا ہوا ہے اور یہ محض اعتقادی بات نہیں ورنہ تم کسی اور کتاب سے تو اتنے مسائل تصوف وسلوک کے نکال دو جو واقع میں تصوف کی کتاب نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ مضمون نکلتا اسی جگہ سے ہے جہاں پہلے سے ہوتا ہے۔ آخر دوسرے دیوان بھی تو ایسے موجود ہیں جن میں دیوان حافظ کا اتباع کیا گیا ہے مگر ان میں سے اتنے مسائل نہیں نکل سکتے کیونکہ وہاں پہلے ہی سے کچھ نہیں۔ غرض عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ جن ضعفاء کو طلب ہو مگر ہمت نہ ہو ان کو ان کی ہمت کے موافق کام بتلانا چاہیے، ہمت سے زیادہ ان سے کام لینا ظلم اور بے مروتی ہے۔

طریق اصلاح وتربیت

میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو آج کل کم کھانے سے نقصان ہوا۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کم کھایا کرتے تھے، مولانا نے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ دماغ خشک ہوجائے گا اور یہ حدیث پڑھی ''المؤمن القوی خیر من المومن الضعیف ''(۲) کہ مسلمان قوی اور مضبوط کمزور سے بہتر ہے کیونکہ تندرست قوی آدمی دوسروں کی بھی خدمت کرسکتا ہے اور کمزور خود دوسروں پر بار

(۱) ''کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کی قوت سے زیادہ کام لینا ظلم کرنا ہے جو شرط مروت کے خلاف ہے'' (۲) حلیۃ الاولیا لابی نعیم: ۱۰/۲۹۶، کشف الخفاء للعجلونی: ۲/۲۲۰، الاسماء والصفات للبیہقی: ۱۵۹۔

ہوتا ہے تو خواہ مخواہ غذا کم کر کے اپنے کو ضعیف بنانا اچھا نہیں اور متقدمین سے جو ایسے مجاہدات منقول ہیں تو ان کے قوی پہلے سے اچھے ہوتے تھے، پھر غذا کم کرنے سے ان کو ضرر اور ضعف(۱) نہ ہوتا تھا، وہ مجاہدات کے بعد اتنا کام کرتے تھے کہ ہم تندرستی کی حالت میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کر سکتے۔ پھر ان مرید صاحب نے مولانا کی ایک نہ سنی اور غذا کم ہی کرتے رہے، پھر ان کو کچھ عربی عبارتیں نورانی حروف میں نظر آنے لگیں۔ مولانا سے بیان کیا وہ اپنے دل میں سمجھتے تھے کہ بس مجھے کشف ہونے لگا اور میں بڑے درجہ میں پہنچ گیا۔ مولانا نے سن کر فرمایا: جنون کا مقدمہ(۲) شروع ہو گیا۔ تقلیل غذا موقوف کر دو(۳) دودھ گھی خوب کھاؤ اور طبیب سے دماغ کا علاج کراؤ ورنہ چند دن میں پاگل ہو جاؤ گے مگر وہ اب بھی باز نہ آئے۔ چنانچہ چند روز کے بعد ان کو جنون ہو گیا، ننگے بیٹھے رہا کرتے اور ذکر کے بجائے گالیاں بکا کرتے۔

اطباء کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ جدا معاملہ اس کے مناسب کرتے ہیں تو شیوخ کاملین بھلا ایسا کیوں نہ کریں گے۔ اگر فہم ہو تو ان کے پاس رہ کر عامی آدمی بھی اس تفصیل کو سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک شیخ کے پاس ایک مرید رہتا تھا جس کی غذا سب سے زیادہ تھی۔ دوسرے مریدوں نے شکایت کی کہ فلاں مرید بہت کھاتا ہے، شیخ نے اس کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی، سالک کو تقلیل غذا(۴) اختیار کرنی چاہیے بہت نہیں کھانا چاہیے بلکہ اعتدال سے کھانا چاہیے۔ اس نے کہا حضرت! ہر ایک کا اعتدال جدا ہے آپ نے پہلے میری غذا تو دریافت فرمائی ہوتی اس کے بعد معلوم ہوگا کہ میرا اعتدال وہی ہے جو میں نے اختیار کیا کیونکہ میں یہاں آنے سے پہلے پچیس روٹیاں کھایا کرتا تھا، اب پندرہ کھاتا ہوں تو اعتدال ہوا یا اعتدال سے زیادہ، اور جو لوگ خانقاہ میں پانچ روٹیاں کھاتے ہیں ان کی غذا پہلے سات آٹھ روٹیاں تھی تو ان کا یہی اعتدال ہے کہ وہ پانچ کھائیں۔ شیخ نے

(۱) نقصان اور کمزوری نہیں ہوتی تھی (۲) پاگل پن کا آغاز ہے (۳) غذا کم کرنا بند کرو (۴) غذا میں کمی کرنی چاہئے۔

فرمایا کہ واقعی تم سچ کہتے ہو۔ بس اس سے کم مت کرنا اور مریدوں سے فرمادیا کہ بھائی وہ زیادہ نہیں کھاتا اپنی خوراک سے بہت کم کھاتا ہے۔

تو دیکھئے کہ صحبت کی برکت سے اس عامی کو خود معلوم ہوگیا کہ ہر ایک کا اعتدال جدا ہے، مجھے اپنی غذا اتنی نہ کم کرنی چاہیے جتنی اور لوگوں کی ہے۔ الغرض شریعت نے تمتع دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ ترجیح دنیا علی الآخرت سے منع کیا ہے۔ پس دنیا کو بقدر ضرورت حاصل کرنا خواہ تجارت سے ہو یا ملازمت سے یہ حرام نہیں۔ ہاں! دین کو برباد کرکے دنیا کمانا حرام ہے۔

ارادہ دنیا کی قسمیں

اس جگہ شاید طلبہ کو ایک اشکال ہوگا۔ وہ یہ کہ قرآن میں تو ارادہ دنیا کی مطلقاً مذمت وارد ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾(۱) ایک اور جگہ ہے: ﴿وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ (وامثالها من الاٰيات)(۲)

سو ان آیات میں ارادۂ دنیا پر بھی وعید وارد ہے۔ طلب اور سعی تو ارادہ سے بھی آگے ہے۔ وہ تو بدرجہ اولیٰ مذموم (۳) ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ''القرآن یفسر بعضه بعضا ''(۴) پس دیگر نصوص کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مطلق ارادہ پر وعید کا ترتب نہیں ورنہ پھر'' اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' کے کیا معنی ہوں گے۔ اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہے تو

(۱) ''جو شخص دنیا (کے نفع) کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے پھر اس کے لیے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندہ (درگاہ) ہوکر داخل ہوگا'' بنی اسرائیل: ۱۸ (۲) ''اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں'' سورۃ الشوریٰ: ۲۰ (۳) بری (۴) قرآن کا بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

بیع وشراء کی اجازت کیوں ہے اور شریعت نے کھیتی پر عشر وغیرہ کیوں واجب کیا۔ اموال میں اور جانوروں میں زکوٰۃ کیوں مقرر کی کیونکہ جب دنیا رکھنا ہی جائز نہ ہوگا تو ان حقوق کے وجوب کی نوبت ہی کہاں آئے گی بلکہ اس تقریر پر تو صاف یہ کہہ دیا جاتا تھا تجارت بھی ممنوع ہے اور زیادہ مال جمع کرنا اور بہت سے جانور پالنا بھی حرام ہے۔ حالانکہ نصوص میں زراعت وتجارت اور زیادہ جمع مال کی کوئی ممانعت نہیں۔ ہاں ممانعت کے بجائے ان کے لیے احکام زکوٰۃ وغیرہ مشروع ہیں۔

پس دیگر نصوص کے ملانے سے ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ ''من کان یرید محض العاجلة'' کہ جو شخص صرف دنیا کا ارادہ کرے اس کے لیے یہ وعید ہے۔ یعنی ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو دنیا محض کا ارادہ کرنا کہ اس کے ساتھ آخرت کا ارادہ بالکل نہ ہو۔ یہ مذموم ہے اور موجب وعید۔ دوسرے دنیا کا ارادہ کرنا آخرت کے لیے کہ تجارت وزراعت وملازمت بطریق حلال اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور اطمینان سے آخرت کے کام بجالائے۔ اس صورت میں اصل ارادہ آخرت ہے اور دنیا کا ارادہ اس کے تابع ہے۔ اس کی مذمت نہیں یہ موجب وعید ہے بلکہ یہ ارادہ تو ایک درجہ میں فرض ہے جس کو یہ حدیث بیان کرتی ہے۔'' طلب الحلال فریضة بعدالفریضة''(۱)

صحابہ کا طلب دنیا

اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہوتا تو قرآن میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے اس کو منسوب نہ کیا جاتا حالانکہ غزوہ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۔۹۰ ، کنزالعمال :۹۲۰۳ رواہ البیھقی والطبرانی والدیلمی عن ابن مسعود وانس وابن عباس ان السخا وبعضھا یوکد بعضا یوکد بعضا لاسیما وشواھد، کثرۃ اہ مقاصد حسنہ ص ۱۴۸۔

حق تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس کے سبب پر متنبہ فرماتے ہوئے بتلایا کہ یہ شکست اس لیے ہوئی کہ ایک جماعت نے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درہ کوہ پر متعین فرما کر یہ حکم دیا تھا کہ تم یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم غالب ہوں یا مغلوب۔ اس حکم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو غالب اور کفار کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر درہ کوہ پر ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور غنیمت کا مال لوٹنے میں مشغول ہوگئے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ﴾(۱)

کہ تم میں سے (یعنی صحابہ میں سے) بعض دنیا کا قصد کرتے تھے اور بعض آخرت کا قصد کرتے تھے اس میں صحابہ کی طرف ارادہ دنیا کی طرف نسبت کی گئی ہے اور جو شخص صحابہ کے فضائل ومقامات سے واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ارادہ مذمومہ کی نسبت صحابہ کی طرف دشوار ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم محض دنیا کا ارادہ کبھی نہیں کرسکتے۔ پھر یہاں کیا مطلب ہے۔ ابن عطاء نے اس کی تفسیر بیان کی ہے یعنی (منکم من یرید الدنیا للآخرۃ ومنکم من یرید الاخرۃ الصرفہ) کہ تم میں سے بعضے دنیا کا آخرت کے لیے ارادہ کرتے تھے اور بعض محض آخرت کا قصد کرتے تھے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ جب صحابہؓ کا ارادہ دنیا آخرت کے لیے تھا تو وہ مذموم نہ تھا۔ پھر اس کو شکست کا سبب کیوں بنایا گیا؟

جواب یہ ہے کہ ارادہ فی نفسہ مذموم(۲) نہ تھا لیکن غلطی اجتہادی سے مفضی (۳) ہوگیا تھا مخالفت حکم رسول کی طرف، اس لیے عتاب ہوا۔

اب مسئلہ بالکل منقح ہوگیا(۴) کہ مذمت ارادۃ الدنیا للدنیا کی ہے ارادۃ الدنیا للآخرت مذموم(۵) نہیں۔ پس نوکری اور زمینداری وتجارت سے کسی کو منع

(۱) سورۃ ال عمران: ۱۵۲ (۲) برانہ تھا (۳) اجتہادی غلطی کی وجہ سے گناہ قرار پایا (۴) بالکل صاف ہوگیا (۵) ممانعت اس طلب دنیا کی ہے جو صرف دنیا کے لیے ہو اور جو طلب دنیا آخرت کے لیے ہو وہ بری نہیں

نہیں کیا جاتا ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اتنی بات دیکھ لو کہ دین تو برباد نہیں ہوتا۔

لفظ دنیا کا نکتہ

آگے حق تعالیٰ ہماری اس غلطی کا منشاء بتلاتے ہیں کہ ہم جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اس کا منشاء کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا ہی میں اس منشاء کی طرف اشارہ فرمادیا ہے کیونکہ لفظ دنیا دنو سے مشتق ہے جس کے معنی قرب کے ہیں یعنی دنیا کے منافع چونکہ عاجل اور قریب اور بالفعل حاصل ہونے والے ہیں اس لیے تم آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دنیا کی لذتیں ہم کو اس وقت حاصل ہیں خواہ وہ لذات مباحہ ہوں(۱) یا افعال معصیت ہوں(۲) اسی وجہ سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں اور آخرت کی لذتیں ونعمتیں ادھار ہیں اس لیے ان کی طرف وہ کشش نہیں جو دنیا کی طرف ہے۔ چنانچہ ایک آزاد شاعر کہتا ہے:

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

یہ عذر تھا طالبان دنیا کا۔ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں اس کو بھی بیان فرمادیا۔ کیا رحمت ہے کہ ہمارا عذر بھی ساتھ ساتھ بیان فرمادیا اور یہ قرآن کی کتنی بڑی بلاغت ہے کہ اس کا کوئی لفظ زائد و بیکار نہیں۔ بہت لوگوں کو اس جگہ لفظ دنیا اختیار کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ وہ اس کو زائد سمجھتے ہوں گے مگر زائد نہیں بلکہ اس میں ہمارے عذر کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے ایسا ہی نکتہ سورہ عبس میں ''اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی''(۳) کے متعلق بیان کیا ہے۔

محبوبانہ عتاب

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کفار قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ فرمارہے تھے کہ اتنے میں

(۱) جائز لذتیں (۲) گناہ کے افعال (۳) سورۃ عبس: ۲۔

ایک نابینا صحابی عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر ہوئے اور انہوں نے پکار کر کہا ''یا رسول اللّٰہ علمنی مما علمك اللّٰہ ''(۱) کہ مجھ کو بھی وہ باتیں بتلا دیں جو خدا تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلائی ہیں۔ اس موقع پر ان صحابی کا سوال کرنا کسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گراں گزرا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ اصول کی تعلیم مقدم ہے فروع کی تعلیم پر پھر یہ تو ہر وقت کے ہیں۔ یہ سرداران قریش اتفاق سے آ گئے ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ موقع تبلیغ کا جاتا رہے اور ان کی تبلیغ صحابی کی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہ صحابی تو ایمان لا چکے ہیں۔ دوسرے وقت بھی احکام دریافت کر سکتے ہیں۔ اور یہ لوگ کافر ہیں جن کو میرے پاس آنے کی طلب نہیں اس وقت اتفاق سے آ گئے تو شاید ان کو تبلیغ احکام سے ہدایت ہو جائے۔ اس خیال کی وجہ سے صحابی کے سوال پر قدرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرانی ہوئی اور چہرہ پر بھی عبوس (۲) کا اثر ظاہر ہوا کہ فوراً حق تعالیٰ کی طرف سے محبت آمیز عتاب نازل ہوا ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی﴾ (۳) یعنی ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ اعراض کرنے لگے اس وجہ سے کہ ان کے پاس ایک اندھا آ پہنچا۔

تو علماء نے لکھا ہے کہ لفظ اعمیٰ میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر بیان فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ سے یہ بات بہت بعید ہے کہ کسی کے آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر بل پڑیں کیونکہ آنے والے کی اس سے دل شکنی ہوتی ہے مگر وہ صحابیؓ چونکہ نابینا تھے جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عبوس (۴) کی اطلاع نہ ہو سکتی تھی اس لیے اس موقع پر عبوس کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر ظاہر ہو گیا کیونکہ اس سے ان کی دل شکنی نہیں ہوئی۔ اگر وہ بینا ہوتے تو ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عبوس کا اثر ظاہر نہ ہوتا۔

رہا یہ سوال کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عذر تھا تو حق تعالیٰ نے

(۱) تفسیر القرطبی: ۲۱۳ (۲) ناگواری کا اثر (۳) سورۃ عبس: ۱، ۲ (۴) ناگواری۔

عتاب کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی شان ہے۔ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے اخلاق اعلیٰ درجہ کے کامل ہوں۔ پس گو اس جگہ بوجہ ایک عارض کے ان صحابی کی دل شکنی نہ ہوئی لیکن وہ فعل تو ایسا تھا کہ اگر صحابی کو اس کی اطلاع ہوجاتی تو ان کی دل شکنی ہوتی۔ پس ایسا فعل کبھی نہ کیا جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے والوں کے لیے دل شکنی کا سبب کسی درجہ میں بھی ہوسکتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔

آج کل لوگ اس کو اخلاص سمجھتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے ناگواری ظاہر نہ کریں اور اگر اس کا اطمینان ہوجائے کہ دوسرے کو ہماری ناگواری معلوم نہیں ہوسکتی تو پھر اس کی رعایت نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمادیا کہ یہ بات کمال اخلاق کے منافی ہے۔

سوال و جواب

اب ایک سوال یہ باقی رہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے اہم کام میں مشغول تھے جو ان صحابی کی تعلیم سے مقدم تھا تو ان صحابی کا اس اہم کام میں مخل ہونا ضرور موجب گرانی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس ناگواری میں مصیب تھے (۱)۔ پھر عتاب آپ پر کیوں ہوا؟ ان صحابی پر ہونا چاہیے تھا کہ یہ ایسے ناوقت کیوں آئے؟

جواب یہ ہے کہ لفظ اعمیٰ میں ان صحابی کا عذر بھی مذکور ہے کہ وہ بوجہ نابینا ہونے کے معذور تھے، ان کو یہ خبر نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کسی کام میں مشغول ہیں اور دوسرا جواب حق تعالیٰ نے آگے بیان فرمایا: ﴿ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ﴾ (۲) جس کا حاصل یہ ہے کہ جن کفار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ فرمارہے تھے وہ طالب نہ تھے۔ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن وہ خود حق سے اعراض کرتے تھے اور صحابی

(۱) آپ کی یہ ناگواری درست تھی (۲) سورۃ عبس: ۵، ۷۔

طالب حق تھے۔ اس صورت میں کفار کی اصلاح موہوم اور صحابی کی اصلاح متیقن تھی تو آپ نے اصلاح موہوم کا اس درجہ اہتمام کیوں فرمایا کہ اس وقت طالب حق کا آنا گراں ہونے لگا۔ اگر ان غریبوں کے آنے سے وہ چلے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتی سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے ساتھ استغناء کا برتاؤ کرنا چاہیئے تھا اور صحابی کی تعلیم میں مشغول ہوجانا چاہیئے تھا جس کی اصلاح یقینی تھی۔

پس یہاں سے یہ مسئلہ بتلادیا گیا کہ منفعت موہومہ (۱) پر منفعت متیقنہ (۲) کو مقدم کرنا چاہیے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابن ام مکتوم کی اصلاح میں ذراسی تاخیر کرنے پر عتاب فرمایا ہے حالانکہ اس تاخیر سے وہ فوت نہ ہوئی جاتی تھی۔ پس تعلیم اصول کی تقدیم اس وقت ہے جب نفع کے مظنون اور متیقن ہونے میں دونوں مساوی ہوں ورنہ متیقن مقدم ہوگا مظنون پر۔ لیکن آج کل عام طور پر مسلمان اس کے خلاف کررہے ہیں کہ ایک موہوم دنیوی منفعت کے لئے اپنے ان منافع دینیہ کو برباد کررہے ہیں جو اس وقت ان کو حاصل ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں ہمارا عذر بیان فرمایا ہے کہ لو ہم تمہارے عذر کو بھی بیان کئے دیتے ہیں کہ تم دنیا کو اس وجہ سے مقدمہ کرتے ہو کہ اس کے منافع قریب اور عاجل ہیں لیکن اس کا جواب بھی سن لو۔

آخرت کی صفات

''وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى'' اس میں جواب ہے اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہوگیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا (۳) اس کی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں۔ سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں۔ ایک خیریت دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار

(۱) جہاں نفع کا گمان ہو (۲) جہاں نفع یقینی ہو (۳) کسی نفع کا جلد ملنا۔

رہنے والی بھی ہے۔ دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے اور نہ وہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دیتا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہوتو پھر تجارت کبھی نہ ہوسکے کیونکہ اس میں سرمایا عاجلہ کو اس وقت لگنا پڑتا ہے اور نفع زائد آجل ہے(۱) لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ سرمایہ کو تجارت میں لگادیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔ معلوم ہوا کہ زیادت وکثرت کے مقابلہ میں وصف عاجل نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے (۲) اور آخرت آجل ہے (۳)۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور عمدہ ہے۔

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہوسکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملادیا جاتا ہے۔ اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو تو بس زرعت کو بھی جواب دے دو۔ مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے۔ پھر آخرت کے مقابلے میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور یہ آجل ہے۔ ارے! وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی بھی قابل نہیں۔

آخرت کی دوسری صفت

اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ ابقیٰ، ہے بہت پائیدار ہے اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اسکے مقابلہ میں صفت عجلت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اس کی صدہا نظیریں ہیں۔

ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اسکے پاس دو مکان ہیں ایک تو کچا

(۱) زائد نفع ملنے کی امید ہے (۲) وہ فی الحال موجود ہے (۳) آخرت کے ملنے کی امید ہے۔

بنا ہوا اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہتے ہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں۔ مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا چاہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کردوں گا۔اب بتلائیے آپ کیا کریں گے؟ یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریۃً ملتا ہو وہ کچا مکان اچھا جو دواماً ملک ہو(۱)

مگر افسوس! تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہے؟ بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے۔

اس ناپائیدار مردار کے لئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتے ہوں۔ پھر مزہ یہ کہ یہاں پر معاملہ برعکس ہے کہ دنیائے عاجل عالیشان، خوبصورت بھی زیادہ نہیں۔آخرت اس سے کہیں وسیع اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوبصورت و عالیشان ہے۔ تو یہاں تم ایک کچے ناپائیدار مکان کے لئے جو عاریۃً مل رہا ہے اور رعایت بھی سال دو سال کے لئے نہیں بلکہ ایک دولمحہ کے لئے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود(۲)۔ ایسے عمدہ و عالیشان محل کو چھوڑتے ہو جو دواماً تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔

اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب! دنیا تو اب مل رہی ہے اور آخرت کا معاملہ ادھار پر ہے۔ صاحبو! دنیا تم کو ایک دولمحہ کے لئے مل رہی ہے جس میں کچھ راحت نہیں کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے جہاں رنج و غم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بے ساختہ کہو گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴾(۳)

(۱) ہمیشہ کے لئے ملتا ہے (۲) شاید یہ سانس ہی آخری سانس ہو (۳) ''جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں ہم کو نہ کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی'' الفاطر: ۳۴،۳۵۔

شبہ کا جواب

اب ایک شبہ رہ گیا۔ وہ یہ کہ طالبان دنیا شاید یوں کہیں کہ ہم جو تجارت و زراعت میں نفع آجل زائد کو عاجل پر ترجیح دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارت وزراعت میں وہ نفع آجل چھ مہینہ یا سال بھر کے اندر مل جاتا ہے اور آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ جانے کب ملے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہوسکتی ہے جب کہ مؤجل کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ مؤجل ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بناء پر عاجل کو ترجیح نہیں ہوسکتی۔

آخرت کا وقوع

اب دیکھو کہ آخرت کا وقوع متحمل ہے یا یقینی۔ فرماتے ہیں: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی ﴾(۱) یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانہ میں دی جارہی ہے۔ لہٰذا یہ عذر بھی باطل ہوا اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے۔ مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوجائے گا اور مرنے میں دیر کیا ہے، زندگی کا دومنٹ بھی بھروسہ نہیں لہٰذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور ایک تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں حضرت ابراہیم وموسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کرکے اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں ہے بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ

(۱) ''اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں'' سورۃ الاعلیٰ: ۱۸۔۱۹۔

حضرت ابراہیم وحضرت موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی تو خدا تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح وعزت وراحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب ومقہور ہوئے اور وہ غالب وقاہر ہوئے۔ دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہوگئے اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع وتعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں تو خیریت و بقاء آخرت کا نمونہ دنیا میں بھی اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ دنیا کی راحت وعزت بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جائے۔ چنانچہ بحمد للہ ہر زمانہ میں جو لوگ آخرت کے طالب ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں ان کو اہل دنیا سے زیادہ راحت وعزت حاصل رہی ہے اور یہی اہل دنیا کا مقصود ہے۔ سو یہ بھی اہل آخرت کو زیادہ حاصل ہے۔ اب اس مضمون پر کوئی اشکال نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دو۔ اس کے بعد طلب دنیا کی بھی ممانعت نہیں بس جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو کہ آخرت تو برباد نہیں ہوتی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق ہو۔

والحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمدا وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔(۱)

(۱) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور آخرت کی فکر ہمارے قلوب میں پیدا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۰/۷/۲۰۱۷